مجھے پیپر کے تصور سے بڑی وحشت ہے

انٹرویو: سید نسیم تقی جعفری　　عکاسی: سمیرا شفیق / محمد آصف ملک

سوال: قرآن خدا کی سب سے بڑی دلیل ہے، حجت ہے اور یہی قرآن کہتا ہے کہ خدا غائب ہے اور اس کو انسان اپنے حواس خمسہ سے کسی طور پا بھی نہیں سکتا۔ لہٰذا کیا خدا کو حاصل کرنے اور پانے کی سبیل ہوسکتی ہے اور ایسا کیوں ضروری ہے؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: ضروری ایک تو سٹیٹس کے لحاظ سے آپ فیصلہ کرتے ہیں۔ ہمارے بہت سارے مختلف ذہنی سٹیٹس ہیں۔ ہر آدمی خدا سے بے نیازی تو برت نہیں سکتا۔ زندگی کے ہر موڑ پر وہ آپ کے سامنے کھڑا ہے۔ بچے کی تلاش میں کھڑا ہے۔ روٹی کی تلاش میں اور عزت وجاہ کی تلاش میں کھڑا ہے۔ یعنی کوئی زندگی کا ایسا رستہ نہیں ہے۔ اگر آپ راستہ بھول جائیں، تو اللہ ہی سے دعا مانگتے ہیں۔ تو مسئلہ یہ ہے کہ سٹیٹس کے مطابق ہمیں خدا کی شناخت عطا بھی ہوتی ہے، ملتی بھی ہے۔ ایک وہ شخص ہے، جو اللہ کے بارے میں زیادہ جاننا چاہتا ہے۔ زیادہ سوچنا چاہتا ہے، تو خدا اتنی آسانی سے ملتا نہیں ہے۔ نظر سے نہ آنا بھی کوئی ایسی دلیل نہیں ہے۔ دیکھیں ایک چیز ہے، جو صبح وشام ہمارے درمیان رہتی ہے اور ہم نے کبھی اسے نظر سے نہیں دیکھا ہوا۔ وہ کبھی نظر نہیں آتی۔ بہت سارے ایسے سائنسی حقائق ہیں، جن تک ہماری نظر نہیں پہنچتی ہے۔ اس کے باوجود ان حقائق کو ہم تسلیم کرتے ہیں۔ آپ دیکھیں کہ ہوا تیز چلے یا آہستہ چلے۔ وہ خوشگوار یا ناخوشگوار ہو۔ نظر نہ آنے کے باوجود ہم اس کے ہر انداز سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح پروردگار عالم نہ نظر آئے۔ پردہ نشیں رہے۔ مگر جو اس کے اثرات ہیں۔ جن کو ہم احساسات، اپنے حواسِ خمسہ سے نہ بھی دریافت کر سکیں، تو حواسِ خمسہ سے آگے بھی انسان کی صلاحیتیں ہیں، جن کے لیے حواسِ خمسہ کی ضرورت نہیں رہتی اور وہ ہماری ذہنی اور قلبی صلاحیتیں ہیں۔ نفسیات میں ماورائے حس ادراک جو عام حواس سے آگے جا کر سوچتی ہے۔ اضافی ٹینشن وہ ہیں، جو زندگی میں بغیر کسی وجہ کے ہمیں بے چین و بے قرار رکھتی ہیں۔ بہت سی اضافی خصوصیات ہیں۔ حواسِ خمسہ سے آگے ہی تو وجودِ عقل ہے۔ اور یقیناً اللہ جو ہے، بہت ساری عقلی وضاحت میں ہوتا ہے۔ سو جیسے آپ کو نہ نظر آنے کے باوجود ہوا چبھتی ہے، اسی طرح نہ نظر آنے کے باوجود پروردگارِ عالم کا معاملہ ہے۔ اس کی محبت، اس کی قوت، اس کا تعلق ہر انسان کو محسوس ہوسکتا ہے۔

سوال: سر! جب خدا غائب ہے اور اس کو پانا انسان کے بس کی بات نہیں ہے اور وہ اگر اس کے عرفان اور ادراک سے عاری اور انکاری ہے، تو اس میں اس کا قصور کیا ہے؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: قصور شاید سب سے بڑا یہ ہے کہ وہ اس مقصد سے گریز کر رہے ہیں، جس کے لیے انھیں پیدا کیا گیا ہے۔ قصور یہ ہے کہ وہ یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کر رہے کہ ہم

کیوں آئے؟ کیوں جا رہے ہیں؟ کیوں رہ رہے ہیں؟ اگر وہ نہیں جاننا چاہتے ہیں اور اتنے ہی بے نیاز ہیں کہ کہتے ہیں، ہمیں کوئی غرض نہیں اللہ سے۔ کوئی ہمیں اس کی شناخت کی آرزو نہیں، تو یقیناً پھر نتائج وہی نکلیں گے، جو اللہ نے ان کے لیے مقرر کر رکھے ہیں۔ پھر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں جنت و دوزخ کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ آپ کے پاس یہ دلیل مناسب نہیں رہے گی۔ کیونکہ آپ اس طرح ایک اتنا بڑا رسک لینے کے لیے تیار ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ مجھے خدا کی کوئی ضرورت نہیں ہے، تو میں کبھی اس سے الجھتا نہیں ہوں۔ کسی کو کیا پتا کہ چالیس برس کسی کو ضرورت نہیں رہی، تو اکتالیسویں مرتبہ کیا واقع پیش آجائے۔

میں نے اسی دلیل میں اپنی آنکھوں سے چھ چھ مہینے میں ان لوگوں کو پلٹتے دیکھا، جنھوں نے مجھے کہا کہ وہ خدا میں یقین نہیں رکھتے۔ وہ کسی خدا کے تصور سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ ایک آدھ سال کے وقفے کے بعد وہی لوگ بڑی شدت اور بڑی اپنائیت سے پھر اسی خدا کو ڈھونڈ رہے تھے، جس کو جاننے کی کوشش نہیں کر رہے تھے۔ چونکہ عبوری دور بڑی ظالمانہ روایت کا حامل ہوتا ہے۔ عبوری دور انارکی کو دیکھتا ہے، ضروری نہیں ہے کہ حل دے۔ اس لئے انارکی میں ہر سوال جو تشکیک کے صحرا میں بے دست و پا گھومتا پھرتا ہے، وہ بے چارہ اتنے ان گنت رستوں میں سے جب کسی رستے کی شناخت نہیں کر پاتا، تو اس بے چارگی اور ناسلجھیا میں بھی اگر اس کا کوئی حل ہے، تو یا تو وہ ساری عمر ہی بغیر کسی یقین کے بھٹکتا پھرے یا خدا کے ہونے کا یقین کرے یا خدا کے نہ ہونے کا یقین کرے۔

سوال: سر اگر اللہ نے تمام مخلوقات میں سے انسان کو اعلیٰ، ارفع اور احسن بنایا ہے، تو پھر حضرت انسان کا دوسری مخلوقات سے کیا مقابلہ ہوسکتا ہے؟ یعنی جب خالق کی منشا، مرضی اور منصوبہ ہی یہی تھا، تو پھر انسان کی عظمت اور برتری کے کیا معنی ہیں؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: انسان کے بارے میں میرا یہ کانسپٹ نہیں ہے نہ قرآن سے یہ کانسپٹ نکلتا ہے کہ انسان سب مخلوقات سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ بہرحال یہ ایک طے بات ہے کہ خدا نے انسان کو زیادہ سے زیادہ، بہترین نہیں بنایا ہے، بلکہ جو قرآن لفظ استعمال کرتا ہے کہ بہترین متوازن بنایا ہے۔ ہم سے اوپر بڑی نفیس مخلوقات تھیں۔ جیسے ملائکہ ہیں۔ پھر دوسری مخلوقات جیسے جنات اور ارواح کے لشکر بے شمار ہیں۔ ان میں ایک نفاست طے ڈالی کہ تبدیلی کی اہلیت ہے۔ وہ اپنی تخلیق اور اپنے پیٹرن پر قادر ہیں۔ جو ہمارے بے شمار نیچے مخلوقات ہیں، وہ 17 لاکھ کے قریب جینز موجود ہیں۔ جانور ہیں، کیڑے مکوڑے ہیں۔ ہم ان سے بہتر ضرور لگتے ہیں۔ لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہم بہترین مخلوق ہوں۔ تخلیقی پراسس میں البتہ احسنِ تخلیق ضرور ہیں۔ بہترین اندازوں سے بنایا ہوا۔ اگر ہم میں روحانیت کے پیٹرن اسی طرح موجود ہیں، جیسے ارواح کی مخلوق میں ہیں اور ہم میں جنسی و جسمانی بھی اسی طرح روایت موجود ہے، جیسے ہم سے کم تر مخلوقات میں ہے اور ہم ان کے

درمیان ایک خوبصورت اعتدال کے حامل ہیں، تو میرا نہیں خیال کہ ہمیں بہترین کا ٹائیٹل دیا گیا ہے۔ بلکہ ہمیں سب سے متوازن کا ٹائیٹل دیا گیا ہے۔

سوال: سر اگر ہر کام اللہ کی منشا اور مرضی کے مطابق ہی وقوع پذیر ہوتا ہے، تو پھر جو لوگ کچھ بھی نہیں کرتے ہیں، ان کو سستی، کاہلی کرنے کا الزام کیوں دیا جاتا ہے اور ان کو معاشرے کے ناکام لوگ یا کردار کیوں کہا جاتا ہے؟ کیا واقعی سب کچھ خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور انسان کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہے؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: جب سے حضرت انسان میں کام تخلیق ہوا، کام چور بھی تخلیق ہوئے ہیں اور بہت سے بے تماشا کارکردگی کے حامل بھی لوگ تخلیق ہوئے ہیں۔ مگر بقا کے دور سے جب انسان باہر نکلا اور بقا کے دور تک مجھے یقین ہے کہ جو اس قابل نہیں تھے کہ فیصلہ کن حیثیت کے حامل ہوتے، وہ لوگ یقیناً ختم کر دیئے گئے۔ بلکہ جیسے بہت سارے تھیسز ہیں، ان میں سے ایک تنازع للبقا بھی ہے۔ مگر اب اگر ہم وہ سستی برداشت کر لیتے ہیں، جو لوگوں میں ہے، تو اس وجہ سے کہ اب بقا کا دور نہیں، تہذیب کا دور ہے۔ اب جو لوگ کچھ نہیں کرتے، وہ بہت کچھ کرتے ہیں۔ وہ سوچ رہے ہوتے ہیں اور انہی نکمے لوگوں میں سے بڑے بڑے فلاسفرز، دانشور اور شاعر تخلیق ہوئے ہیں۔ مگر سچ پوچھئے، تو کام کرنے والوں کو رستہ دکھانے والے یہی کام چور ہوتے ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ جو کام چوری جس کو ہم اس معنی میں گنتے ہیں، وہ ایک بڑے لیول پر کمتر کوالٹی ہے۔ وہ اعلیٰ فکری کوالٹی کے حامل لوگوں میں نہیں۔ یہ لفظ ہم کام چور بالعموم ان لوگوں کو کہتے ہیں، جو تھوڑی سی محنت کے ساتھ روٹی کما سکتے ہیں۔ پیسے کما سکتے ہیں۔ تعلیم حاصل کر سکتے ہیں، مگر وہ نہیں کرتے۔ مجھے ایک ڈائیلاگ Alice in wonderland کا بہت پسند ہے، جس میں mouse کو کہتا ہے You are wasting the time. (تم وقت ضائع کر رہے ہو) تو وہ کہتا ہے Time wasted is also time. (ضائع شدہ وقت بھی تو وقت ہے۔)

میں ایک عملیمثال سے گزرا ہوں۔ ایک دفعہ تپتی دوپہر میں جب کہ لو لب و رخسار کو جھلس رہی تھی۔ آنکھوں میں تھکن کے سائے پڑ رہے تھے اور سڑکوں کی تارکول دھواں دے رہی تھی۔ میں باہر سے آ رہا تھا، تو میں نے دیکھا کہ ایک ریڑھے والا اسے بڑی مشقت سے کھینچ رہا تھا۔ پسینہ اس کی جبیں سے کسی چشمے کی طرح رواں تھا۔ اس کے ہاتھ تھوڑی دیر کے لئے رکتے اور پھر وہ آگے لے جاتا۔ تو میں نے آسماں کی طرف دیکھا اور میرے ذہن میں اقبال کا مصرعہ آیا ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات۔ مگر دوسرے لمحے میں حیران رہ گیا کہ یہ وہ کام چور ہے، جو بہت کام کا ہے۔ میں تعلیم سے پڑھ لکھ کے ذرا مہذب انسان ہوں۔ میں اس مشقت کا تصور بھی نہیں کر سکتا، جو یہ شخص کر رہا ہے۔ میں نے ایک گلہ سا اللہ کے حضور کیا کہ اس کا کیا قصور ہوگا کہ جس کو آپ نے اتنی مشقت میں ڈالا ہے۔ پھر حیران کن انکشاف ہوا کہ اگر خدا میری طرح سوچتا، تو پھر یہ بھی ریڑھا نہیں کھینچ سکتا تھا۔ سوچ کے یہ پیٹرن میری نگاہ میں آئی کہ اللہ نے جس سے کوئی کام کرانا ہوتا ہے، اس کے مطابق اس کے ذہانت کے سوال ہوتے ہیں۔ اس کی سوچ ہوتی ہے اور اس کا خیال ہوتا ہے۔ اگر یہ شخص بھی اسی قسم کے مقدرات کے سوالات میں اور گلہ گزاری میں پڑ جائے، تو یہ اتنا اداس اور ڈیپریس ہو جائے گا کہ اس کے ہاتھ پاؤں شل ہو جائیں گے اور یہ زندگی کے حقائق کو سامنا کرنے کے قابل نہیں رہے گا۔

دوسری بات یہ کہ جسے ہم کام چوری کہتے ہیں، یہ نسبتی ہے۔ ہم کسی انسان کے بارے میں مسلسل پوری طرح نہیں جانتے ہیں۔ اس کی پوری زندگی پر حاوی معاملات کو نہیں جانتے۔ اس لئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ جو شخص آج کام چور ہے، کیا وہ حقیقتاً ایسے ہی ہے۔ میرے اپنے چند بھائی بڑے کام چور تھے۔ مگر جب ان کو مواقع ملے ہیں، تو انہوں نے بے تحاشا کام بھی کیا ہے، محنت بھی کی ہے۔ چنانچہ جسے ہم سستی یا ست الوجودی کہتے ہیں، یہ قریباً قریباً ہر اچھے برے بندے پر کسی نہ کسی وقت ضرور حملہ آور ہوتی ہے۔ میں اسے وائرس تو نہیں کہوں گا، مگر یہ ہر انسان کے اندر جینیاتی طور پر ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ ست روی کا شکار ہوتا ہے۔ کوئی ذہنی اور کوئی جسمانی سستی کا شکار ہوتے ہیں۔ جیسے کچھ لوگوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ فلاں دیکھو، کتنا کام چور تھا۔ اللہ نے اسے کتنا دے دیا اور فلاں نے کتنی محنت کی اور فلاں موقع کو کیچ کیا، وغیرہ۔

قرآن پاک میں اللہ کہتا ہے کہ تمام مخلوقات کا ریموٹ کنٹرول میرے پاس ہے۔ چونکہ میں نے زندگی چلانی ہے، کام چلانے ہیں۔ چونکہ میں ہی سب کچھ کر رہا ہوں۔ انسان کچھ بھی نہیں کر رہا، اس لئے پیشے تخلیق کرنے، پیشہ ور تخلیق کرنے، زندگیاں سنوارنی، زندگیاں بگاڑنی، روٹی کمائی، روٹی سے گریز کرنا، بیماریاں تخلیق کرنا میں نے ہی کرنا ہے۔ ایک آیت قرآن حکیم میں خداوند کریم یہاں تک چلے گئے، تو اصحابِ رسول نے پوچھا، یا رسول اللہ ﷺ اگر یہ سارا مقدر ہے، تو پھر ہم کیا کریں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو کام اللہ نے کسی سے لینا ہوتا ہے، اس کے مطابق اس میں جذبہ، داد اور اس کے محرکات تخلیق کر دیتا ہے۔ اب آپ دیکھیں یہ بات 100 فیصد سچ ہے اور قرآن حکیم سے اس بات کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے کہ زمین پر کوئی ایسا ذی حیات نہیں ہے، جسے ہم نے اس کے ماتھے سے نہیں تھام رکھا۔ ماتھے کے نیچے فوربرین ہوتا ہے۔ فیصلہ کرنے والا ہوتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام عملی زندگی میں اللہ جس سے کوئی کام کرانا چاہے گا۔ خواہ وہ سستی کا ہے یا سرگرمی کا، وہ اس کے فوربرین کے کنٹرول کے ذریعے کرے گا۔

جیسے ایک بچھو کی عادت کاٹنا نہیں ہے۔ مگر جب اسے کاٹنا ہوگا، تو اللہ اس کے اوپر ایک کنٹرول ایکسرسائز کرے گا اور جو معاملہ جس قسم کا ہے۔ اسی طرح سانپ کے کاٹنے سے اگر کوئی مرتا ہے یا ایک سانپ کے کاٹنے سے اگر ایک ڈاکٹر کو ٹیکا لگانا پڑتا ہے، تو یہ تمام اعمال اس طرح کے ہیں کہ خدا ان کا بندوبست کرتا ہے۔ اس سے پیدا ہوتے ہوئے نتائج کا اہتمام کرتا ہے۔ ان تمام نتائج و فرائض کے مقاصد ہوتے ہیں اور یہ مکمل طور پر اللہ کے کنٹرول میں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کس چیز کے لئے انسان کو آزاد چھوڑ دیتا ہے؟ میں نے ایک دفعہ ڈیگال کا بیان سنا۔ اس نے الجزائر میں فوج بھیجی تھی۔ کسی نے پوچھا کہ آپ نے غیر ملک میں فوج بھیج دی، تو آپ نے کچھ بندوبست کیا؟ اس نے کہا کہ ہم نے اتنے مکمل انتظامات کئے ہیں کہ اگر ایک سپاہی کو ایک سوئی کی بھی ضرورت ہے، تو وہ بھی ہم نے اس کے سامان میں ڈال دی ہے۔ اب آپ خود غور کیجئے کہ آسمانوں سے ایک بالکل بے کس اور مجبور ناآگاہ ہستی کو اللہ نے زمین پر بھیجا ہے۔ کیا اس کو پورے بندوبست کے ساتھ نہ بھیجتا؟ کیا زمین میں اس کے اسباب نہ پیدا کرتا؟ کیا اس کے بال بچوں کے اسباب نہ پیدا کرتا؟ اگر ایک شخص خدا کے حضور جا کر یہ کہتا ہے کہ میرے مالک تو نے تو کچھ بھی نہیں کیا ہوا۔ رزق مجھے کمانا پڑا۔ بچوں کو پالنا پڑا۔ ماں باپ کی

> جسے ہم سستی یا ست الوجودی کہتے ہیں، یہ قریباً قریباً ہر اچھے برے بندے پر کسی نہ کسی وقت ضرور حملہ آور ہوتی ہے۔ میں اسے وائرس تو نہیں کہوں گا، مگر یہ ہر انسان کے اندر جینیاتی طور پر ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ ست روی کا شکار ہوتا ہے۔ کوئی ذہنی اور کوئی جسمانی سستی کا شکار ہوتے ہیں۔ جیسے کچھ لوگوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ فلاں دیکھو، کتنا کام چور تھا۔ اللہ نے اسے کتنا دے دیا اور فلاں نے کتنی محنت کی اور فلاں موقع کو کیچ کیا، وغیرہ۔

خدمت کرنی پڑی۔ مجھے کہاں فرصت ملی کہ میں تیرے مقاصد کی تکمیل کرتا۔ اگر وہ سچا ہے۔ اگر واقعی اس نے یہ کام خود کرنے ہیں، تو پھر وہ سچا ہے اور اللہ کا اس کو سزا دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ اللہ کہتا ہے کہ تم غلط کہتے ہو۔ تمہارے اول و آخر سانس تک تمہارے تمام تخلیق کے کاموں تک، تمہارے تمام معمولات زندگی اور اسباب کے میں نے بندوبست کئے، کنٹرول کئے اور جسے ہم جبر کہتے ہیں، وہ زمان و مکاں کو آپس میں جوڑنے کا نام ہے۔ جبر یہ نہیں ہے کہ اس نے آپ کے لئے چند سزائیں یا چند انعام مخصوص کئے ہوئے ہیں۔ جبر یہ ہے کہ ایک لمحۂ زمانہ کو ایک مقام میں سمو دینا۔ جیسے ہم آج یہاں بیٹھے ہوئے ہیں اور بات چیت ہو رہی ہے، تو یہ مکان پہلے سے بندوبست کیا گیا۔ آپ کا آنا طیکیا گیا۔ بات کرنا طیکیا گیا اور پھر اس تمام چیز کے مقاصد پہلے سے تعین کر دیئے گئے۔

اب دیکھنا پڑے گا کہ اتنی سارے انتظامات جو اللہ نے اتنے سخت کنٹرول پروٹوکول میں رکھے ہوئے ہیں، اس پروٹوکول میں خدا کا مقصد کیا ہے؟ تو میں اس کو ایک مثال سے واضح کروں کہ میں ایک صاحب کو ایک خط اور پیسے دیتا ہوں کہ لاہور جا۔ دیکھو، یہ ہوٹل کا کرایہ ہے۔ یہ کھانے کے لئے پیسے ہیں۔ اگر تو تفریح کرنا چاہے، تو یہ بھی ہے ساتھ اور اگر تو سونا چاہے، تو یہ آرام دہ بستر کے اتنے پیسے ہیں۔ یہ بھی تیرے پاس ہیں۔ کسی سے ملنا چاہے، تو سواری بھی کرائے پر لے لینا۔ البتہ ایک کام تو نے کرنا ہے کہ یہ خط جو ہے، یہ فلاں شخص کو ڈلیور کرنا ہے۔ اب تین دن کے بعد وہ شخص واپس تشریف لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سرکار میں نے تو بہت انجوائے کیا۔ کھایا پیا۔ بڑی سیریں کیں۔ میں نے باغ دیکھے۔ حسین چہرے دیکھے، بلکہ عطاالحق قاسمی کے سفرنامے کی طرح رہا۔ تو وہ سارا کچھ، جو کسی حالات میں ہوتا ہے، وہ سب کچھ کیا۔ تو میں اسے کہتا ہوں کہ یار بہت اچھا، لیکن اس خط کا کیا بنا؟ وہ مجھے آگے سے کہتا ہے کہ سرکار وہ خط دینا بھول گیا ہوں۔ تو آپ کا کیا خیال ہے، میں کیا سوچوں گا اور کیا کروں گا؟

تو بات یہ ہے کہ پروردگار عالم نے سارے اسباب، ساری سہولتیں، ساری رہائشیں مہیا کرنے کے بعد انسان کو کہا کہ تو نے اس تمام سفر میں ایک خط دینا ہے اور وہ خط یہ ہے، جو قرآن کی آخری آیت میں اللہ نے کہا ہے۔ بلاشبہ انسان زمانے میں بہت برس رہا۔ یہ مفرد سیل تھا۔ ہم نے اسے ڈبل سیلکر دیا۔ پھر ہم نے چاہا کہ اس مخلوق کو آگے بڑھا کر اور ٹیسٹ کروں۔ پھر ہم نے سماعت دی۔ بصارت دی۔ جسم انسان کو مکمل کیا۔ اعضا پورے کئے۔ اس کے بعد ہم نے اس پر ایک فرض عائد کیا کہ یہ تجھے عقل و شعور اس لئے بخشا ہے کہ چاہو تو ہمیں مانو، چاہو تو ہمارا انکار کر دو۔

آپ دیکھتے ہیں، آزادی کہاں ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہاں جبر نہیں ہے۔ یہاں خود خدا کہہ رہا ہے کہ چاہو تو مانو، چاہو تو انکار کر دو۔ اب جو بات وہ خود کہہ رہا ہے، وہ جبر میں نہیں آسکتی۔ یہ جو آپ کو آزادی دے دی کہ چاہو تو مانو، چاہو تو نہ مانو، یہ ہی آپ کا ٹیسٹ ہے۔ اب آپ قبر کے دہانے پہنچ گئے۔ وہاں اللہ میاں کے حضور پہلا سوال یہ ہوا کہ من ربك آپ آگئے ماشاءاللہ۔ زندگی گزار آئے۔ جو کھانا تھا، کھا آئے۔ جو پینا تھا، پی آئے۔ جو لطف اندوز ہونا تھا، لطف اندوز ہو لئے۔ خدا کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس خط کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ من ربك اس عرصہ حیات میں جو آپ نے زندگی میں گزارا، مجھے بتایئے کہ آپ کا رب کون تھا اور آپ بھول جائیں۔ کنفیوز ہو جائیں۔ آپ نے کہیں سنا تھا۔ لوگ کہتے تھے۔ روایت تھی۔ میں کچھ اس بارے میں زیادہ سنجیدگی سے سوچ نہیں سکا۔ تو اللہ کہتا ہے کہ بے شک میرے بندے نے جھوٹ کہا۔ اس نے اپنے بنیادی مقصد حیات کو نظر انداز کیا۔ اس نے میری دی ہوئی ہر نعمت کو انجوائے کیا اور اس نعمت کے بدلے جو اس نے خط تقسیم کرنا تھا، وہ نہیں کیا۔ یہ خلاصہ انسانی جبر و قدر کا ہے۔

سوال: سر ایک بندہ اپنے خالق و مالک کو کیونکر راضی کر سکتا ہے یا اس کے معیار پر پورا اتر سکتا ہے؟ کیا مالک و خالق کبھی اپنے کسی بندے سے راضی ہوا ہے؟ آپ کوئی اس کی وضاحت پیش کر سکتے ہیں؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: شاہ صاحب یہ تو میرے خیال میں آپ کے گمان پر ہے۔ اللہ تو صرف ایک صفت بتاتا ہے۔ حضرت محمد ﷺ نے بھی وہی بات کہی۔ اللہ نے بھی وہی بات کہی کہ شیطان نے کہا کہ تیرے سارے ہی بندوں کو میں گمراہ کروں گا۔ اوپر سے نیچے سے، دائیں سے بائیں سے، ہر راستے سے آؤں گا، گمراہ کروں گا۔ تو اللہ نے کہا کہ ہاں تو کرے گا۔ مگر جو میرے لئے ذرا برابر بھی اخلاص رکھتے ہیں، تو ان کو گمراہ نہیں کر سکتا۔ یہ اخلاص اتنی نادر الوجود شے ہے کہ اس کا ایک ذرا بھی اللہ کے پورے فرائض کو کر جاتا ہے۔ یہ انتہائی تخلیے میں انس اور محبت اللہ کے نزدیک آپ کی نجات کے لئے ایک فیصلہ کن امر ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ آٹھ چیزوں پر اللہ نے نارِ دوزخ حرام کر دی اور اس میں سے ایک چیز یہ بتائی کہ وہ نوجوان جس کی آنکھ سے اللہ کے لئے ایک آنسو نکلا۔ سو برأت نجات تو ایک آنسو ہے۔ دیکھنا یہ پڑے گا کہ کبھی نکلا کہ نہیں نکلا۔ اخلاص کے بغیر کبھی آنسو نہیں نکل سکتا اور یہ چاہتیں کبھی مفروضہ نہیں ہو سکتیں۔ ہم اپنے محبوب ترین لوگوں سے جھوٹ بول سکتے ہیں۔ ان کو ڈاج کر سکتے ہیں، مگر ہم خدا کو ڈاج نہیں کر سکتے۔ ہم اس سے جھوٹ نہیں بول سکتے۔ وہ ہماری کیفیت ذات پر حاوی ہے۔ اس لئے کہ اس نے ہمیں بنایا ہے۔ میں حیران ہوں کہ ہمارے تمام جذباتی احساسات اور جذبات یہ سائنس ہیں۔ اگر آج کے لوگوں میں ان کیفیات کی پرکھ اور طرح ہے، تو یہ اور بات ہے۔ مگر شاید آنے والا وقت گواہی دے گا کہ تمام جذبات سائنس ہیں۔ تمام احساسات ایک سائنسی قانون کے تحت ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ انہی کے اصول مرتب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے انہی میں اپنے مطلب اور غرض کی شے رکھی ہے۔ اب یہ آپ منافقت برتیں۔ آپ دل سے چاہیں نہ چاہیں۔ آپ جھوٹ بولیں، ہم لوگ تو اس سے ڈاج ہو سکتے ہیں، مگر اللہ نہیں ہو سکتا اور اسی لئے اس نے اپنا اسم گرامی لطیف و خبیر رکھا ہے کہ اگر زمین کی ساتوں تہوں سے نکل کر اگر ایک ذرا بھی تمہارے اندر اخلاص و خلوص کا موجود ہے، تو ہم اسے اٹھا لیں گے۔ ہم اسے نکال لیں گے اور ایک حدیث سنئے۔ آپ حیران ہو جائیں گے کہ قیامت کے دن ایک شخص کا پلڑا گناہوں کا چھور رہا تھا۔ نیکی والا پلڑا خالی تھا اور وہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ اس کی نجات کی کوئی شے اس کے پلڑے میں نہیں پڑی ہوئی تھی۔ تو اللہ نے کہا کہ ایک پرزہ اس میں ڈال دیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس میں کاغذ کا پرزہ ڈالا گیا، تو وہ پلڑا زمین کو چھونے لگا اور گناہوں کا پلڑا آسمان چھو گیا۔ لوگوں نے پوچھا ہوگا، سوچا ہوگا کہ اس پلڑے میں کیا تھا؟ تو پتہ چلا کہ اس نے دل سے ایک مرتبہ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کہا تھا۔ چنانچہ نجات اتنی آسان ہو، لوگ اس کے بارے میں فکر کیوں کرتے ہیں۔ کیوں پریشان ہو جائیں کہ ہم کو اللہ بخشے گا، نہیں بخشے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اعتماد کہ اللہ بخشے گا، باعث نجات ہے اور اگر آپ گوں مگوں اور شک و شبے میں پڑ گئے کہ اللہ بخشے گا، نہیں بخشے گا، تو آپ منافق ہیں۔ میرے نزدیک یہ نفاق کی علامت ہے کہ لوگ کہیں، پتا نہیں میں بخشا جاؤں گا کہ نہیں بخشا جاؤں گا۔ میرے نزدیک یہ کفر کی علامت ہے کہ کوئی کہے، میرے گناہ اللہ کی رحمت سے بڑھ گئے ہیں۔

سوال: ایک آپ کی شخصیت اور ذات کے حوالے سے سوال ہے کہ آپ لوگوں کے نام پوچھ کر ان کے حالات، مزاج، رویے، ترجیحات، رجحانات اور میلانات کے بارے میں ایک مکمل رپورٹ پیش کر دیتے ہیں۔ کیا یہ پیری، ریاضت، تقسیم، اندازہ و قیاس اور روحانیت ہے یا کچھ اور ہے؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: میرا اپنا خیال یہ ہے کہ یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ البتہ قرآنی علوم کی تشریح اور وضاحت کرتے بہت عرصے سے میں نے بہت سے لوگوں کے دعوے سنے ہیں۔ حروف مقطعات کے بارے میں بہت دعوے سنے، مگر میں اس کو علم نہیں مانتا، جس کا مظاہرہ نہ ہو۔ ایک علم جس کا آپ دعویٰ کرتے ہیں، آپ کے پاس

موجود ہے۔ مگر اس کا اظہار نہیں ہوسکتا ہے، تو ہم اس دعوے سے کیسے اتفاق کر سکتے ہیں؟ میں نے حروف مقطعات کو دیکھا۔ سوچا سمجھا۔ میں اسے اسرار نہیں کہوں گا۔ کیونکہ اسرار ایک ایسا لفظ ہے، جو لوگوں کو کنفیوز کر دیتا ہے۔ اس کے کچھ حقائق کا مجھ پر انکشاف ہوا۔ چونکہ مقصد خدا کی تلاش تھی، اس لئے میں اس کو پوری طرح نہیں چیک کر سکا۔ مگر ہولے ہولے میرا یہ تجسس بھی چلتا رہا۔ پھر یہ انکشاف ہوا اور یہ انکشاف میں دو چار احادیث سے آپ کو سناؤں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے حضرت عمر بن خطاب نے ایک دفعہ سوال کیا کہ علی یہ کیا بات ہے کہ کچھ لوگ بڑے عبادت گزار ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود ہمارے دل ان کی طرف مائل نہیں ہوتے اور کچھ لوگ بہت گئے گزرے ہوتے ہیں، مگر ہمارے دل ان کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ امیر المومنین یہ مسئلہ میں نے حضور ﷺ سے پوچھا تھا، تو انہوں نے مجھے یہ بتایا کہ اللہ نے جب ارواح کے لشکر تخلیق کیے، تو ان میں کچھ کی کچھ سے موافقت ٹھہرادی اور کچھ کی کچھ سے مخاصمت ٹھہرادی۔ اب جو موافقت اور مخاصمت آسمان پر تھی، زمین پر ویسی ہی ظاہر ہوتی ہے۔ اس سوال کے بعد میرے ذہن میں ایک دریچہ ضرور کھلا کہ آخر یہ موافقت اور مخاصمت کے کچھ قانون تو ہوں گے۔ تو شاہ صاحب میں نے ان قوانین کی تلاش کی۔ خدا کا بڑا کرم ہے کہ کچھ ایسے قوانین سے میری آشنائی بھی ہوئی اور میں انسان کو اس کی بنیادی کیٹیگری سے جاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر میں زیادہ اس طرف جاتا، تو مجھے ڈر تھا کہ میں اپنے بنیادی موضوع سے نا آگاہ ہو جاؤں گا۔ اس میں بڑا تخصص تھا، بڑی طاقت تھی۔ بڑے انکشافات تھے۔ تمام کائنات کا کشف تھا۔ مگر میں اس کی طرف راغب نہیں ہوسکا۔ کیونکہ میری ساری زندگی کا مقصد یہ ہی رہا کہ میں اللہ سے اس طرح اس کو جاننے کی کوشش کروں کہ وہ بھی مجھے تھوڑا سا جان جائے۔ میں اپنے اس مقصد کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکا اور اللہ نے میرا خیال ہے، تھوڑا سا علم مجھے مستعار دے دیا کہ لوگوں کے کام آئے۔ اسے میں نے کبھی بھی طاقت کے طور پر نہیں استعمال کیا۔ مگر اس کثرت سے اس کو مظہر کیا ہے کہ اس کے علمی اصول میں کبھی کبھی ضرور انشاء اللہ لوگوں تک پہنچاؤں گا۔ مگر اس میں سب سے بڑی احتیاط جو لازم ہے، یہ ہے کہ کوئی اس کو غلط استعمال نہ کرے۔ میرے پاس جتنے بھی بزرگ یا عقلمند لوگ آتے ہیں، وہ تجسس کی بجائے اختیار کو لپک پڑتے ہیں۔ ظاہر ہے، ایسے لوگوں کو اس قسم کے علوم سے آگاہی دینا بہت ساری مخلوقِ خدا کا نقصان کرنے کے برابر ہے۔ میں نے کم از کم اس کو کسی ذاتی منفعت، کسی ذاتی وقار کے لئے استعمال نہیں کیا، جو میری ذات کی خواہشات میں سے ہو۔ مگر یہ میری آرزو ضرور ہے کہ میں اس عجیب و غریب علم کے حقائق کسی نہ کسی دن چند مخصوص احباب کے سامنے بیان کروں۔ کیونکہ یہ علم آگے بڑھنا چاہیے۔

اس میں ایک اور بڑی مزے کی بات یہ ہے کہ جب میں قرآن حکیم پڑھا کرتا تھا، تو حروف مقطعات پر آ کر رک جایا کرتا تھا۔ الم پر آ کر رک جایا کرتا تھا۔ میں اکثر سوچتا تھا، میں نے کبھی بھی ان لوگوں کے ساتھ اتفاق نہیں کیا، جو یہ کہتے ہیں کہ یہ زبان کے لفظ ہیں، انداز کے لفظ ہیں۔ میں یوں ہی سوچتا رہتا تھا۔ ایک دن میں اللہ میاں سے الجھ پڑا۔ میں نے کہا، یا اللہ اگر یہ حروف مقطعات ہمارے سمجھنے کے لئے نہیں ہیں، تو قرآن کی بیشتر اور بھی آیات ہمارے سمجھنے کے لئے نہیں ہوں گی۔ پھر یہ آفاقی حیثیت قرآن میں کیسے پیدا ہوسکتی ہے؟ کچھ تو ہو کہ ہم ان کو سمجھنے کے جاننے کے قابل ہوسکیں۔ یہ سارا قرآن میرے لئے ہے۔ ہمارے لئے ہے۔ یہ کیا ہوا کہ چند الفاظ ہی اسرار ہیں۔ اس کو آپ نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اگر اسرار ہیں، تو ہوں۔ مگر کسی کو آگاہ بھی تو ہونا چاہیے۔ پھر اس کے بعد میرا یہ گلہ سنا گیا اور مجھے ان حروف کی کچھ ایسا پس منظر اور علم عطا کیا گیا کہ اب میں کہہ سکتا ہوں کہ ہو سکتا ہے، میری اپروچ کے علاوہ بھی حروف کی طرف کوئی اور اپروچ موجود ہو۔ مگر جو میں اظہار کر رہا ہوں اور ہزاروں لوگوں میں کر رہا ہوں اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس میں آنکھیں بند کر کے اور ارتکاز کر کے مکر و فریب کے سانچے استعمال کئے جا رہے ہوں۔ بالکل معمول کے مطابق یہ چیز علم کا حصہ ہے۔ عجب و غریب کوئی صفت نہیں ہے۔

سوال : آپ لوگوں کو باطنی، خارجی، گھریلو اور ذاتی حالات سدھارنے اور متوازن بنانے کے لئے تسبیحات بھی دیتے ہیں۔ کیا یہ کسی مخصوص عقیدے کا پرچار ہے یا کسی نیک تحریک کی بنیاد ہے؟

پروفیسر احمد رفیق اختر : تحریک آپ کہہ سکتے ہیں۔ میں مذہب کو اس کی اصل ترجیح کی طرف لا رہا ہوں۔ میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کوشش یہ کی ہے کہ مذہب کے الجھاؤ سے لوگوں کو نکال کر ایک جو کائناتی ترجیح ہے۔ جو تمام مذاہب کی ہے اور تمام مذاہب ایک ہیں۔ میرا یقین ہے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک بہت ساری ترجیحات بدلی گئیں۔ بہت ساری چھوٹی موٹی تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ یہ سارے قوانین آئے۔ ایک آدھ قانون آتا، پھر وہ قانون بدلا گیا۔ مگر ایک مقصد مذہب کا جوازلی اور ابدی ہے کہ یہ خدا کی طرف جانے کا رستہ ہے اور خدا کو جاننے کا۔

میں ایک چھوٹی سی بات آپ کو بتاؤں کہ محبت اور انس میں کسی انسان کی محبت کا کیا امکان ہوسکتا ہے؟ جو میں نے اللہ سے بات پائی ہے، وہ یہ ہے کہ محبت کا صرف ایک امتحان ہے کہ آپ تنہا ہو جاؤ اور آپ کا محبوب آپ کی آنکھوں سے جدا ہو۔ اگر آپ سمجھتے ہو کہ میرے آٹھ محبوب ہیں، جو میری آنکھوں سے جدا ہیں، تو تنہائی میں جو آپ کو زیادہ یاد آئے گا، وہی اصلی ہوگا۔ میرے خیال میں خداوند کریم کو اس بات کا ہم سے بہت پہلے علم ہے کہ یہ لوگوں کے بڑے دعوے ہیں کہ اللہ کی بڑی عبادتیں اور ریاضتیں ہو رہی ہیں۔ الٹی سیدھی حرکات کا نام انھوں نے مجاہدات رکھ دیا ہے۔ میرا خیال ہے، اللہ کا بندوں کے لئے جو بہترین ٹیسٹ ہے کہ جب ہم اس سے دور ہوتے ہیں اور ہمارے حجابات نظر حائل ہوتے ہیں، تو پھر جو اللہ کو صحیح معنوں میں چاہتا ہے، وہ اللہ کو یاد بہت کرتا ہے۔ کیا خوبصورت آیت ہے کہ بہت کم ایسی خوبصورت آیات میرے دل میں اتر جاتی ہیں، جس میں اللہ نے بڑی عجیب سی بات کہی کہ فرمایا: (ترجمہ) بھلا سوچو، تو کون اضطراب میں مضطرب کی صدا سنتا ہے اور کون ہے، جو تمہاری برائیوں کی، مصیبتوں کی اور مصائب کی گرہیں کھولتا ہے۔ اور جب یہ دونوں باتیں ختم ہوتی ہیں، تو کون ہے (ترجمہ) جو زمین پر تمہیں سیادت اور قیادت بخشتا ہے۔ خدا کہتا ہے کہ یہ اللہ ہی تو ہے اور اللہ کہتا ہے کہ تم اسے یاد بہت کم کرتے ہو۔

قرآن میں یاد، یادداشت اور یادہانی صفحے صفحے پر لکھی ہے۔ قرآن بذات خود یاد ہے اور یہ یاد رہے کہ یہ میرے اللہ کی کتاب ہے۔ اس کا انس اس کتاب سے کیسا ہوگا اور طاق میں سجا رکھا جانے والا قرآن کیسا ہے اور مساجد میں رٹا جانے والا قرآن کیسا ہے؟ مگر وہ شخص جب قرآن کو ہاتھ میں یہ سمجھ کر لیتا ہے کہ میرے دوست کی میرے اللہ، میرے محبوب کی کتاب ہے۔ میرے انس کا ایک رابطہ اور تعلق قرآن میں ہے، تو اس کے احساسات بدل جاتے ہیں۔ اللہ نے اپنے بہترین بندوں کی مثال دیتے ہوئے کہا: (ترجمہ) کہ میرے بندے تو کھڑے، بیٹھے، کروٹوں کے بل مجھے یاد کرتے ہیں۔ اسی یاد میں آگے جا کر جب حج کے ایام کا ذکر کیا گیا، تو کہا: (ترجمہ) جب تم رسم و رواج پورے کر بیٹھو۔ مناسک پورے کر بیٹھو (ترجمہ) تو مجھے ایسے یاد کرو، جیسے آباؤ اجداد کو کرتے ہو۔ جیسے اپنے پیاروں کو کرتے ہو، بھولوں بسروں کو یاد کرتے ہو۔ جن کی یاد تمہارے ذہنوں سے جاتی نہیں ہے۔ مگر تھوڑا سا کچھ اور بھی کرو۔ (ترجمہ) ذرا زیادہ کرو گے کہ مجھے محسوس ہو، معلوم ہو کہ تم ہر چیز سے بڑھ کر مجھ سے پیار کرتے ہو۔ اب اس خدا کو آپ کیا کہیں گے کہ جو یہ چاہتا ہے کہ ہر چیز سے بڑھ کر آپ اسے پیار کریں۔ اس کے بارے میں جابر اور قہار ہونے کا تصور کتنا چھوٹا سا لگتا ہے۔

میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ یہ وہ خدا ہے، جس کو سب

سے زیادہ درست طور پر نہیں سمجھا گیا۔ آپ سوچتے نہیں ہیں کہ اس کی جو جبر وقہر کی صفات ہیں، وہ کن لوگوں کے لئے ہیں۔ ماننے والوں کے لئے تو نہیں ہیں۔ سارے کے سارے قرآن میں جبر و قہر کی آیات کفار مکہ کے لئے ہیں۔ ایک شہر تھا، جس پر آتش برس رہی تھی۔ غضب برس رہا تھا۔ وہ مجسم قہر تھا۔ کافروں کو سزائیں سنا رہا تھا۔ عذاب کی وحی دے رہا تھا۔ ان کو کیا کچھ نہیں کہہ رہا تھا اور ایک دن اس کے پیغمبر نے کہا: (ترجمہ) جاؤ آج کے دن تم پر کسی قسم کا کوئی مواخذہ نہیں۔ ایک دن میں وہ سارے عذاب یافتہ اللہ کے قریب ہو گئے۔ آپ کبھی اس پہلو سے سوچتے ہیں؟ کبھی اس بارے میں غور نہیں کیا کہ ساری عذاب کی آیات اہل مکہ کے لئے ہیں۔ پھر اہلِ مکہ میں کتنے عذاب یافتہ ہوئے؟ دس، بیس، تیس بس! یہ سوچنا بڑا مشکل ہے میرے لئے کہ اللہ کے پاس اپنی مخلوق کے لئے محبت اور کرم کے سوا اور کوئی شے بھی ہے۔ یہ ہمارے گمان کی بات ہے کہ ہم خدا کو کیا سمجھیں، کیا جانیں۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اللہ کے قریب جانا بہت آسان ہے۔

سوال : سر جب آپ لوگوں سے ان کے نام پوچھ کر ان کے حالات اور معاملات کے متعلق بیان کرتے ہیں، تو اکثر اوقات لوگوں کو حیرت ہوتی ہے اور وہ آپ کو ایک پیر اور روحانی بزرگ سمجھ کر عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ آپ کو ایک غیر معمولی ہستی قرار دیتے ہیں۔ اس وقت آپ کے ذاتی احساسات کیا ہوتے ہیں اور آپ کیسا محسوس کرتے ہیں؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: میرے خیال میں وہ اس بات کو نہیں جانتے کہ میں کس قدر ہوشیار آدمی ہوں۔ میرا تو مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو بھی عزت واحترام وہ دے رہے ہیں، اس کو میں ان کے فائدے کے لئے استعمال کروں۔ میرا خیال یہ ہوتا ہے کہ میں اس چکر میں ہوں کہ یہ میرا احترام کریں اور میں انھیں خدا کی یاد پر لگا دوں۔ میری بہت سادہ سی نیت ہے کہ کوئی بندہ اگر مجھ سے ذہنی اور علمی طور پر متاثر ہوتا ہے، تو میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس تاثر میں یہ ایک ڈائریکٹ لائن قبول کرتے ہوئے اللہ کی طرف جانے کا رستہ قبول کرے۔ تاکہ خداوند کریم اس کی وجہ سے یا اس کی اس تبدیلی کی وجہ سے شاید مجھ پر مزید احسان فرمائے۔ مجھ پر بہت کرم فرما دے۔ میری بھی مدد ہوتی ہے کہ میں اللہ سے تھوڑا سا فائدہ لے لوں۔ میں کمیشن ایجنٹ ہوں۔ بھئی میں اللہ کے لئے بندہ دے کر معاوضہ اس سے لے لیتا ہوں۔ میرا تو کام بڑا آسان ہے۔ تو بات یہ ہے کہ عزت واحترام لوگوں کے اپنے احساسات ہیں، اپنے احساس ہیں۔ خالی ان حیرت انگیز انکشافات کی وجہ سے نہیں۔ لوگ آج کل بڑے سیانے ہیں۔ بعض لوگوں کو میں نے ایک مہینے میں دس دس پیر بدلتے دیکھا ہے۔

پیر کے تصور سے مجھے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ سچی بات بتاؤں، پیر ہونے کے تصور سے مجھے بڑی وحشت ہے۔ ایک معمولی سی تبدیلی کے ساتھ بھی انسان بڑی آسانی سے پیر ہو سکتا ہے اور جتنی عقیدتیں چاہے، وہ وصول کر سکتا ہے۔ مگر میں نے ایک اصولی بات کہی تھی کہ عقیدت علم کی دشمن ہے۔ اس لئے میں ان پیروں کی طرح اپنے روپ کو ڈھالنا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں، لوگ آزاد رہیں۔ میں نے سوچا ہے، سمجھا ہے، غور کیا ہے کہ اگر سول سروسز میں ملک کے بہترین دماغ چاہیے ہوتے ہیں، تو اتنی بڑی کائنات کے مالک کو ان سے بہتر لوگ چاہییں۔ مگر جب میں لوگوں کو پیروں اور قلندروں اور ان ڈیپریس لوگوں کے پیچھے جاتا دیکھتا ہوں اور جادوگروں کے پیچھے، تو مجھے بڑا افسوس یہ نہیں ہوتا کہ لوگ ان کو کیا سمجھتے ہیں، مجھے افسوس یہ ہوتا ہے کہ یہ خدا کو چھوٹا کر رہے ہیں۔ اللہ کی یہ چوائس نہیں ہو سکتی۔

پیر کے تصور سے مجھے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ سچی بات بتاؤں، پیر ہونے کے تصور سے مجھے بڑی وحشت ہے۔ ایک معمولی سی تبدیلی کے ساتھ بھی انسان بڑی آسانی سے پیر ہو سکتا ہے اور جتنی عقیدتیں چاہے، وہ وصول کر سکتا ہے۔ مگر میں نے ایک اصولی بات کہی تھی کہ عقیدت علم کی دشمن ہے۔ اس لئے میں ان پیروں کی طرح اپنے روپ کو ڈھالنا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں، لوگ آزاد رہیں۔ میں نے سوچا ہے، سمجھا ہے، غور کیا ہے کہ اگر سول سروسز میں ملک کے بہترین دماغ چاہیے ہوتے ہیں، تو اتنی بڑی کائنات کے مالک کو ان سے بہتر لوگ چاہییں۔

سوال: سر جیسے ابھی آپ نے فرمایا ہے کہ عقیدت علم کی دشمن ہے اور کسی جگہ آپ نے یہ بھی کہا ہے کہ جہاں اندھی عقیدت پیدا ہوتی ہے، وہاں ایک بت تخلیق ہوتا ہے۔ لہٰذا جب لوگ آپ سے اندھی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں، تو آپ کو کیسا لگتا ہے؟ اور کیا آپ لوگوں کو ایسا کرنے سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہیں؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: اندھی عقیدت فاصلہ پیدا کرتی ہے۔ آپ کو پتا ہونا چاہیے، وہ خواہ اکیڈیمکس میں ہوں یا ذاتی تعلقات میں، میں حیران ہوتا ہوں کہ لوگ مجھ میں اور اپنے آپ میں کوئی فاصلہ محسوس نہیں کرتے۔ میں جس حال میں ہوں، میری ان میں قربتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ فاصلے اندھی عقیدت میں ہوتے ہیں۔ میرا خیال یہ کہتا ہے کہ مجھے لوگوں سے بڑا انس اور محبت ہے، تو وہ مجھے عقیدت میں نہیں، محبت میں دیکھتے ہیں۔ کیونکہ عقیدت تو فاصلہ پیدا کر دیتی ہے۔ بڑی بڑی مذہبی جماعتیں، جو بڑی بڑی اخلاقیات کی تعلیم دیتی آئی ہیں، ان میں بھی بڑوں اور چھوٹوں کے درجات اتنے بن جاتے ہیں کہ چھوٹے کارکنوں کو سالہا سال کسی بڑے امیر سے ملنے کا موقع نہیں ملتا۔ مگر ادھر حال بڑا مختلف ہے۔ ادھر لوگ اتنے قریب آجاتے ہیں اور ہر قسم کی گفتگو اور سوال کرتے ہیں، تو مجھے کبھی کبھی وہ سنت رسول لگتی ہے اور ایک واقعہ یاد آجاتا ہے، جو حافظ ابن کریم نے کہا کہ میرے مرشد آرہے تھے، تو میں نے ان کو ملنے جانا تھا۔ یہ بڑا دلچسپ واقعہ ہے، جو میرا خیال ہے، اس سوال کو واضح کر دیتا ہے۔ انھوں نے کہا، میں نہایا دھویا۔ میں نے سفید کپڑے پہنے، خوشبو لگائی۔ داڑھی کو خوب اچھی طرح بنایا۔ بال سنوارے اور امامہ باندھا۔ جب میں دروازے تک آیا، تو میں نے سوچا، کوئی کمی نہ رہ گئی ہو۔ پلٹ کے پھر آئینہ دیکھا۔ جب میں آئینہ دیکھ رہا تھا، تو میرے ذہن میں بڑا عجیب سوال آیا کہ اگر آج رسول اللہ ﷺ زندہ ہوتے اور مجھے خبر ملتی کہ وہ ہیں، تو کیا میں اتنا اہتمام کرتا؟ تو میرے دل نے قسم کھائی کہ ایسا نہ ہوتا۔ میں تو دیوانوں کی طرح بھاگتا ہوا جاتا۔ جس حال میں ہوتا، چلا جاتا۔

تو بات یہ ہے کہ یہ جو عقیدتوں کا طور طریقہ ہے، تو الحمدللہ شاہ صاحب میری زندگی میں کبھی آیا ہی نہیں۔ بلکہ بہت سارے لوگ اس لئے خفا ہو گئے، جو روایتی خیال کے مالک تھے۔ جن کے پیٹرن مقرر ہوئے پڑے تھے۔ ان کے اپنے اندازے تھے کہ اس طرح ہونا چاہیے۔ ان لوگوں کو میں کبھی پسند نہیں آیا اور بعض ایسے میرے محبوبان تھے، جو یہ تبدیلی مجھ میں چاہتے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ مجھے مشورہ دیا کہ اگر آپ تھوڑا سا پیٹرن بدل دیں، تو کیا ہے۔ تو مختصراً یہ کہ اگر کوئی اس طرح مجھے قبول کرتا ہے اور معمول کے مطابق ہے اور اگر مجھے اپنا آپ تبدیل کر کے کسی سے قبول کروانا ہے، تو میں منافق ہوں۔ اس لئے میرا خیال یہ ہے کہ میرا لوگوں سے عقیدت کا نہیں، بلکہ محبت کا رشتہ ہے۔

سوال: آج کل ہمارے معاشرے میں جو پیری ومریدی کا مروجہ تصور چل رہا ہے اور جس طرح ان پڑھ لوگوں کو روحانیت اور تصوف کے نام پر لوٹا جا رہا ہے، کیا آپ اس کی تائید کرتے ہیں یا آپ کے نزدیک یہ موزوں نہیں ہے؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: شاہ صاحب بات یہ ہے کہ میں اس کی کس طرح تائید کر سکتا ہوں۔ میرا نہیں خیال کہ لوگوں کا اپنے پیر صاحب کے پاس نذر دینا برا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ لوگ اپنے پیر ومرشد کے پاس جاتے ہیں، تو یہ بھی کوئی بری بات ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ مرشد جب اپنے مرید کا ذہن بند کرتا ہے، تو یہ گناہِ عظیم ہے۔ جب مرشد اپنے مرید سے سوچنے کی صلاحیت چھین لیتا

ہے،تو اس سے بڑا ظلم کوئی نہیں ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ سب سے بڑی زیادتی جو اس وقت پیری مریدی میں ہو رہی ہے، یہ ہے کہ مرشد کوشش کرتا ہے، مرید اس سے کوئی سوال نہ پوچھے اور مرید کو دھمکی دی جاتی ہے اخلاقی و ذہنی کہ اگر کوئی گستاخی کی، تو مقام بزرگی سے گرا دیئے جاؤ گے۔ جب اس قسم کی حرکات ہو رہی ہوتی ہیں، تو اس پیری مریدی کو مافیا ضرور کہا جا سکتا ہے۔ مافیا کو کسی طور بھی کوئی اخلاقی نظام نہیں کہا جا سکتا نہ اس کو کسی طور کوئی تعلیمی نظام کہا جا سکتا ہے۔

سوال: سر کیا کسی پیر کی اولین ذمہ داری اپنے غریب مریدین کے دکھوں، قرب اور معاشی بدحالی کا مداوا کرنا نہیں ہے یا مریدین کی ذمہ داری اپنے پیر کے مسائل اور دکھوں کو حل کرنا ہے؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: مریدین کی ایسی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی مرشد مریدین کی طرف اس نظر سے دیکھے گا، تو وہ اپنے توکل کے سٹیٹس پر پورا نہیں اترا تا اور مرشد اللہ کے اور رسول ﷺ کے اس قول پر ہوتا ہے اور سنت پیغمبران پر ہوتا ہے کہ جب بھی پیغمبر لوگوں کو کوئی تعلیم دیتے، وہ ان سے ہمیشہ یہ کہتے کہ ہمارا اجر تو ہمارے رب کے پاس ہے۔ اب رب نے بھی ظاہر ہے، کچھ اسباب متعین کرنے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اس بندے کی آسانی کے لیے، خدمت کے لئے اور بڑے بندے کے لئے ظاہر ہے کہ کوئی عثمانِ غنیؓ چاہیے۔ کوئی علی مرتضیٰؓ چاہیے۔ کوئی صدیقِ اکبرؓ کی تجارت چاہیے۔ تو اس معاشرے میں وہ لوگ جو پڑھ لکھ کے سمجھداری سے اپنے مرشد کو کلیئر کر دیتے ہیں۔ آپ کسی کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے بعد آپ اس کی نیات کو دیکھ سکتے ہیں۔ ورنہ جھوٹ کہاں بھٹکتا ہے۔ دو دو چار چار کی پیری فقیری آرام سے زمین پر آ گرتی ہے۔ ہمارے سامنے بے شمار پیر پیدا ہوئے۔ بے شمار فقیر اٹھے، پھر وہ بے نام و نشان ہو گئے۔ رہنے والی چیز تو صداقت اور علم ہے۔ اس لئے مرید کا خیال رکھنا تو پیر کے فرائض میں سے ہے، مگر مرشد کا خیال رکھنا مرید کے فرائض میں سے نہیں ہے۔ اس کے مالی فوائد میں نہیں ہے۔ وہ اپنی بقا اور رزق کے لیے خدا کو دیکھتا ہے اور مرید کبھی کبھی واسطہ بھی دیکھ لیتا ہے۔

سوال۔ آج کل دیکھا گیا ہے کہ اکثر پیر لمبی لمبی ٹھنڈی گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں۔ ان کے پلازے ہیں۔ ان کے بے حد و شمار بنک بیلنس ہیں۔ وہ ایک شاہانہ ٹھاٹ سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ جب کہ دوسری طرف عوام و مریدین خطِ افلاس سے کہیں نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ کیا یہ تضاد و فرق ظلم و ناانصافی نہیں ہے؟ آپ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: شاہ صاحب بات یہ ہے کہ یہ سوال ایک دوسرے سے منسلک ہی لگتا ہے۔ اب مسئلہ سب سے بڑا یہ ہے کہ میرا نہیں خیال کہ آپ ان کو پیر یا استاد کہہ سکتے ہیں۔ بنیادی طور پر کسی بھی پیر جو وہ استاد کے ہم معنی ہوتا ہے، سمجھنے اور سمجھانے کے ہم معانی ہوتا ہے۔ چونکہ آگاہی کے بارے میں ہوتا ہے۔ یہ سارے پیٹرن ختم ہو گئے ہیں۔ ایک معزز شخص نے کہا کہ میں فلاں پیر صاحب کے بڑا سخت خلاف ہوں۔ اس لئے کہ میں نے ان کو سات لاکھ روپے محبتوں اور عقیدتوں کی وجہ سے نقد دیئے ہیں۔ تو میں نے کہا، اب تمہارا کوئی حق نہیں بنتا کہ ان سے گلہ کرو یا پیسے واپس لو۔ میں نے کہا کہ سات لاکھ روپے میں اگر تمہیں عقل کا کوئی سبق نصیب ہو جائے، تو سستا ہے۔ جو آپ پلازے دیکھ رہے ہیں، پیٹرن دیکھ رہے ہیں، یہ انہی مریدین کی وجہ سے ہے، جو اپنا سب نیک نہیں دیکھتے ہیں۔ جیسے خواجہ فرید الدین گنج شکر بیٹھے تھے اور بے تحاشا ہجوم تھا۔ روٹی بٹ رہی تھی، تو ایک مرید آیا۔ اس نے کہا، خواجہ تمہیں پریشانی نہیں ہو رہی ہے کہ اتنا بڑا ہجوم ہے۔ یہ لنگر کیسے بندوبست ہوتا ہے؟ تو خواجہ نے کہا کہ جب سے میں نے قرآن کی یہ آیت پڑھی ہے کہ میں نے تمام کام اللہ کو سونپے ہیں، وہ اپنے بندوں کو دیکھنے والا ہے۔ اس کے بعد مجھے کبھی پریشانی نہیں ہوئی۔ اگر کوئی پیر اس توکل اور اس سٹائل کا ہے، اس کے علم کا ہے۔ سو اللہ اسے ایک چھوڑ دس پلازے دے۔ وہی آپ کی بات ہے کہ

گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی

میراث میں آئی ہے یہ مسند ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

سوال: سر میں معذرت سے کہوں گا کہ آپ کا انداز زندگی اور رہن سہن بھی تو آن بان اور شان والا ہے۔ آپ بڑے بڑے اجتماعات منعقد کرتے ہیں۔ سارا سارا دن آپ کے پاس لوگوں کا میلا لگا رہتا ہے۔ آپ اس مہنگائی کے دور میں یہ زندگی کے معاملات کس طرح سیٹل کرتے ہیں اور آپ کے ذرائع معاش اور ذرائع آمدن کیا ہیں؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: اگر آپ پیچھے لاہور جائیں اور ان سے پوچھیں کہ یہ کیسے رہتا رہا ہے، تو آپ کو معلوم ہو گا کہ دو چیزیں میری زندگی میں ہمیشہ ہی شامل رہی ہیں۔ کھانا کھلانا، دوست ڈھونڈنا اور کپڑے ڈھونڈنا اچھے پہننے کے لئے۔ جب ہم انتہائی غریب ماں باپ کے بچے ہوتے تھے، تو ہم خوبصورت جیکٹ سلوا کر دونوں علیحدہ علیحدہ پہنتے تھے۔ کیونکہ مجھے بہرحال اچھے کپڑے پہننے کا شوق ہے۔ یہ میرے ساتھ بہت شروع میں اکٹھے رہے ہیں۔ تو ہم اکٹھے رہے۔ ہم نے ایک تو فلم دیکھنی کبھی نہ چھوڑی اور اس دن ہم فاقہ کرتے تھے، جب ہمیں فلم دیکھنی ہوتی تھی اور اچھے کپڑوں کا یہ عالم تھا کہ ان کے تھوڑے سے حالات بہتر تھے، تو میرے لئے کوئی اچھی جیکٹ سلواتے تھے۔ میں اس کو کسی نہ کسی دن ضرور پہنتا تھا۔ یہ شوق شروع سے ہے۔ میرا ہمیشہ یہ خیال ہے کہ

Presetation should be worth presented. (پیشکش ہمیشہ پیش کئے جانے کے لائق ہونی چاہیئے)

باقی رہے یہ اسباب، تو اس پس منظر میں نہیں جانا چاہتا تھا کہ میرے اسباب کیا ہیں؟ بہت سارے لوگوں کو شاید شدید مایوسی ہو، مگر اتفاق دیکھئے گا کہ آج میرے بنکر میرے پاس بیٹھے ہیں۔ اگر آپ ان سے پوچھیں کہ پروفیسر صاحب کا کیا حال ہوتا ہے۔ میں اکثر اپنے اخراجات کے لئے ان کو کہتا ہوں کہ یار تھوڑے بہت پیسے تیار رکھنا۔ کبھی قرض مانگنے کی ضرورت پڑ جائے گی۔ یہ جو میرے پاس بظاہر آپ کو گاڑیاں نظر آتی ہیں، یہ میرے دو احباب نے خلق کے لئے صدقہ کی ہوئی ہیں کہ آپ کو چونکہ آنا جانا بہت پڑتا ہے، اس لئے آپ یہ قبول کر لیں۔ کم از کم میرا خیال ہے کہ اس لحاظ سے ان کو ٹنوں ثواب پہنچ چکا ہے۔ کھانا کھلانے کی بات یہ ہے شاہ صاحب کہ جب کبھی بھی کسی کو میری استعداد جتنی ہوتی ہے، اس دن یا اگلے دن اس کے مطابق کھانا کھلانا پسند کرتا ہوں۔ میں خوراک میں اچھے ٹیسٹ کا قائل ہوں اور میری خواہش ہوتی ہے کہ کھانا کھلانے کے لحاظ سے وہ مجھے رئیس سمجھے۔ چاہے اور کسی لحاظ سے کچھ سمجھے نہ سمجھے۔ ایک دفعہ آپ کو یاد ہو گا۔ شاید آپ اس اجلاس میں موجود تھے کہ لوگوں نے کہا آپ بڑا اسراف کرتے ہیں۔ اتنا بڑا جلسہ کرتے ہیں۔ اتنا شاندار کھانا کرتے ہیں، تو یہ تو اسراف ہے۔ تو میں نے انہیں ابن عباس کا قول سنایا (یہاں کچھ لائنیں لگتا ہے، کہیں مس ہو گئی ہیں۔ ایڈیٹر)... جو بیکار تھیں، وہ صدقات کے طور پر مسجدِ نبوی ﷺ پر لٹکا دیں۔ تو اللہ کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ اتنا غصہ آیا کہ فرمایا، اچھا اپنے لئے تم بہترین چیز چنتے ہو اور میرے لئے نکمی ترین منتخب کرتے ہو۔ اے لوگو! اگر تم اپنی بہترین چیز نہیں دے سکتے، تو درمیانی چیز تو دو۔ ہم تو کوشش کرتے ہیں کہ اللہ کے نام پر کیا ہوا جلسہ اچھا ہو۔ اگر آپ میرے کسی شادی بیاہ کے فنکشن پر آئیں۔ اس کو آپ اتنا اچھا نہیں پائیں گے، جتنا کہ ہم اللہ کے لئے اپنے جلسے پر اہتمام کرتے ہیں۔ بلکہ میرے اکثر جو بھائیوں کی شادیاں ہوئیں، تو ہمارے معیار عمومی سے ہوتے ہیں۔ مگر جو فنکشن ہم خدا کے لئے کرتے ہیں، جس میں ہم لوگوں کو اللہ کے نام پر بلاتے ہیں، ان فنکشنز پر خوراک کا معیار میرا خیال ہے، پوری دنیا کے معیار کے مساوی ہو گا۔

(باقی حصہ آئندہ شمارے میں)

بسلسلہ مجھے پیر کے تصور سے بڑی وحشت ہے (2)

روحانیت سے سیاست اور شعر و ادب تک

انٹرویو: سید نسیم تقی جعفری عکاسی: سمیرا شفیق / محمد آصف ملک

سوال: سر کیا پیری فقیری اور روحانی شخصیت بننے یا ہونے کے لئے دنیا کے مسائل اور غیر معمولی ٹھاٹ، پروٹوکول، معاشی آسانیاں، سامانِ تعیش اور امراء سے تعلقات ہونا ضروری ہیں؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: میری نگاہ میں تو بالکل نہیں ضروری۔ بلکہ جو لوگ میرے پاس آتے ہیں، میرا خیال ہے، بہت سارے گواہ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ہمارے یہاں کسی قسم کا کوئی خصوصی پروٹوکول نہیں پایا جاتا۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ لٹریری اور علمی وقار کی شخصیات کا میں زیادہ احترام کرتا ہوں۔ تعلیمی شخصیتیں ہوں۔ وقار کی شخصیتیں ہوں، ان کا مگر سرکاری وقار نہیں۔ اور میرا خیال یہ ہے کہ میرے پاس عہدے والے لوگ ایک ہی طرح سے آتے ہیں۔ ان کا کوئی اس قسم کا تصور نہیں ہے نہ ان کو کوئی خصوصی پروٹوکول دیا جاتا ہے۔ مگر آپ دیکھیں گے کہ بعض جو بڑے لوگ ہیں۔ بڑے لوگ کیا، ان کو بڑا کہنا میں لفظ بڑا تو نہیں استعمال کروں گا۔ ان کے اپنے کچھ مسائل ہوتے ہیں۔ جیسے وہ عوام سے شرمیلا پن محسوس کرتے ہیں۔ جیسے وہ اپنی بات ایک مجمع میں نہیں کرنا چاہتے ہیں، تو ان کو علیحدہ ٹائم دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کی عزت کی جا رہی ہے۔ بلکہ بعض اوقات مجھے غریب آدمی ایک کمرے میں لے جاتے ہیں کہ میرا بڑا مسئلہ ہے۔ مجھے آپ یہ بتا دیں، تو مجھے اس وقت جانا پڑتا ہے۔ جو لوگ میرے ساتھ اخفا اور تخلیہ چاہتے ہیں، چاہے معاملہ وہی نکلے، جو ساری دنیا کا ہے، تو ان کو پھر ہم لوگ پرائیویسی دیتے ہیں۔ زیادہ تر وہ لوگ اشرافیہ میں پائے جاتے ہیں۔ اشرافیہ کو پرائیویسی دینے کا قطعاً مطلب دوسرا نہیں ہوتا ہے۔ ایک بات خواجہ مہر علی نے اپنی کتاب میں ذکر فرمائی ہے کہ شاید اشرافیہ کا کسی شیخ کی طرف متوجہ ہونا اس کے اس سٹیٹس کی نشاندہی کرتا ہے، جس پر خدا نے اسے متمکن کیا ہوتا ہے۔

سوال: کیا دولت روحانی بزرگی اور فقر کے راستے کی رکاوٹ ہے یا دولت کی فراوانی سے فقر کی دنیا اور نکھر جاتی ہے اور اس کے حسن اور جاذبیت میں اضافہ ہو جاتا ہے؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: میرا خیال ہے کہ اس دفعہ جہاد پر جو میں نے لیکچر دیا تھا، اس میں میں نے واضح کیا کہ جو لوگ علمی، ادبی اور عباراتی رستے سے گزرتے ہیں، ان کی مشقتیں، ان کے مسائل بے شمار ہوتے ہیں اور قرآنِ حکیم میں جب وہ اولیاء کے درجے تک پہنچتے ہیں، تو خدا کہتا ہے کہ میرے دوستوں پر ہم کسی قسم کا خوف و حزن نہیں چھوڑتے ہیں۔ یہ رستہ طویل ہے۔ مشکل اور جنونِ عقل کا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے ہی کم لوگ اس رستے کو کوالیفائی

کرتے ہیں۔ علمی گریڈ مختلف ہو جاتے ہیں۔ فضیلتوں کے گریڈ مختلف ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ یاد رکھیے گا، جو ابھی میں نے آپ سے کہا ہے۔ اس کے برعکس ایک صاحب مالدار شخص ہے۔ جس کے پاس بہت مال ہے اور وہ خدا کے رستے پر خرچ کر دیتا ہے، تو اس کے بارے میں اللہ فرماتے ہیں (قرآنی آیت)۔۔۔۔ وہ لوگ جو اللہ کے رستے میں مال خرچتے ہیں۔ رات میں یا دن میں، چھپا کے یا بتا کے، اس کا اظہار کر کے (قرآنی آیت)۔۔۔۔۔ ان کو اللہ کی طرف سے ایک اجر دیا جائے گا (قرآنی آیت)۔۔۔۔ تو آپ دیکھیے کہ اولیاء اللہ کا اور صاحبِ ثروت لوگوں کا خدا کے رستے میں خرچنے کا اجر برابر ہے۔ ایک ولی جو فقر و فاقہ سے جدوجہد کر رہا ہے، تو وہ سٹیٹس جس کو پہنچتا ہے، وہ ہے کہ اسے خوف اور حزن سے نجات مل جاتی ہے۔ دوسری طرف ایک بندہ یہ بالکل نہیں کر رہا ہے۔ وہ صرف مال کما رہا ہے اور مال خرچ کر رہا ہے لوگوں پر اور بتا کر شہرت کے لیے کر رہا ہے۔ شوشا کر رہا ہے، اس کو بھی اللہ وہی صلہ دے رہا ہے (قرآنی آیت)۔۔۔۔

سوال: کیا فرش نشین اور گودڑی نشین کے لئے اپنی نفس کی خواہشات کے خلاف عمومی بندوں سے بے نیاز ہونا ہی حقیقی بزرگی ہے اور نہایت لاتعلقی کی حالت میں زندگی گزارنا ہی روحانیت اور فقر کی دنیا کی کامیابی کی دلیل ہے؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: دیکھیے! حضور پاک ﷺ نے ایک شخص کو نیا جوتا پہنے دیکھا، تو اسے دعا دی۔ پہنو اور ہڈاؤ۔ کسی کو اچھا لباس پہنے دیکھا، تو اس کو دعا دی۔ فرمایا، اگر تمہارے پاس مال ہے، تو اس کا اظہار تمہارے جسم و جان پر ہونا چاہیے۔ یہ فقر و فاقہ کی یہ روایات جو ہمارے پاس آئی ہیں، میرا اپنا خیال ہے کہ خود ساختہ ہیں۔ دیکھیں اصحابِ صفہ بھی تھے۔ اصحابِ صفہ کے پاس تو اسباب نہیں تھے کہ وہ اچھے کپڑے پہنتے۔ اچھے جوتے پہنتے۔ تو ان کا احترام بہت ہے کہ فقر و تنگی کے رستے سے خدا تک پہنچے۔ دوسری طرف عثمان غنیؓ تھے۔ ایک طرف ابوذر غفاری تھے، ادھر وہ تھے۔ تو اسلام میں دونوں رستوں کی کشادگی بتائی گئی ہے۔ تاہم دونوں رستوں میں ایک ہی چیز اہم سمجھی جاتی ہے اور وہ اخلاص ہے۔ اس لحاظ سے اسلام اتنا متوازن مذہب ہے۔

باقی میں سمجھتا ہوں کہ جس لحاظ سے لوگوں نے جدوجہد کے یہ مختلف طریقے نکالے ہیں، یہ ان کے اپنے مسائل ہیں، اللہ کے نہیں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے نہیں ہیں۔ قرآنِ حکیم میں اللہ میاں کہتا ہے کہ یہ جو رہبانیت کے طریقے تھے۔ بھوکے مرنا اور چلے کھینچنا، ان میں کچھ لوگ نبھا گئے ہیں۔ کچھ نہیں نبھا سکے۔ ہم نے انھیں ایسا کرنے کو نہیں کہا تھا اور اچھا کھانا اور پھر یہ تعریف کرنا؟ ایک دفعہ جب اچھی چیز سامنے آئی، تو اصحاب چپ رہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم سے تو جنات بہتر ہیں کہ جنھوں نے کہا تھا

-------تو کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ اچھے کھانے میں حسن نہیں ہوتا؟ ہم نے حسن کو محدود بڑا کر دیا ہے۔ کسی دستِ مشاق کی بنی ہوئی کوئی اچھی ڈش میں حسن نہیں ہے؟

بات یہ ہے کہ سرجن اور قصائی میں کیا فرق ہے؟ کلچر کا فرق ہے۔ کلچر اور علم کا فرق ہے۔ اسی طرح ایک اچھی چیز کے لیے آپ بازار میں ایک کیک ڈھونڈنے جاتے ہیں۔ وہ 35 روپے کا مل جائے گا۔ یہ اس کی اصل قیمت ہے۔ مگر اسی کی پیشکش ایک اچھی بیکری سے آپ دیکھتے ہوں، تو وہ 100 یا 125 کا ہے۔ اچھی پیش کشکے آپ کتنی خوشی سے 60,70 روپے اضافی دیتے ہیں۔ سو کسی بھی چیز میں اگر بہتری ہو، صلاحیت ہو، خوش اسلوبیت ہو، حسن ہو، اس کو سراہنا لازم ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ آپ اچھے کھانے میں سے دو لقمے چھوڑ دیں، تو آپ صوفی ہو گئے۔

سوال: جب سلطانی، درویشی اور فقیری جیسے ادارے اور میدان بھی عیار اور مکار لوگوں سے بھر جائیں، تو پھر ایک عام آدمی کا کیا بنے گا؟ وہ کیوں کر زندگی گزار سکے گا اور اس کی فطری رہنمائی کون کرے گا؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: بات تو آپ نے درست کہی۔ مگر بات دونوں طرف ایک ہی ہے۔ میں نے کشف المحجوب کے ابتدائی صفحے پڑھے، تو آپ نے بڑی ایک خوبصورت بات کی۔ کہا کہ ابوسید ابوالخیر ہم تو جب تعلیم اور درستگیٔ اعمال کے لیے گزرتے، تو ہم نے بے شمار مرشدوں سے ملاقات کی اور ہم نے سبق سیکھے۔ ہم نے خراسان کی پہاڑیوں میں تین سو پینسٹھ اولیاء اللہ دیکھے۔ مگر ایک وقت آئے گا کہ طلب تو ہو گی، تجھے رہبر کوئی نہیں ملے گا۔ تو ڈھونڈنے چلے گا، تجھے کچھ نظر نہیں آئے گا۔ اتنی بات یاد رکھنا کہ جس اللہ نے پہلے کو عطا و بخشش کی ہے، تمہیں بھی کرے گا اور اس کو کوئی واسطے نہیں چاہئیں۔

سوال: اب میں ذرا سا پیٹرن چینج کرتا ہوں اور ایک سیاسی سا سوال ہے کہ ہمیں قائدِ اعظم کے بعد آج تک مخلص اور باشعور قیادت نصیب نہیں ہوئی۔ ہم پچپن سال سے اپنے ملک میں مثبت تبدیلی اور انقلاب کا خواب دیکھ رہے ہیں اور مسلسل دھوکے کھا رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب جس باغ کا مالک خود اپنے باغ کو تباہ و برباد کرنے کے درپے ہو، تو پھر اس باغ کا انجام کیا ہو سکتا ہے؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: شاہ صاحب ایک بنیادی فرق آپ کو بتاؤں کہ قائدِ اعظم پڑھا لکھا بندہ تھا۔ اس کے پاس پڑھے لکھے لوگ نہیں آئے۔ جو بھی اس کا پروفیشن تھا۔ جس مقصد کا بیڑا اس نے اٹھایا اور جو طریقہ اس نے اختیار کیا، اس کو اپنے مخالفین کے آلات کا پتا تھا اور اپنے آلات کا پتا تھا۔ ان کی اپروچ کا پتا تھا اور اپنی اپروچ کا پتا تھا۔ اس پر مستزاد ان کو اپنے اور ان کے مقاصد کا پتا تھا۔ اس کو میں سیاسی راہنما نہیں کہہ سکتا۔ وہ مدبر تھا، دانا تھا اور اس کے اس اخلاص کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جو اسے کریڈٹ بخشا، وہ آپ کے سامنے ہے۔ پاکستان میں بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کی تقسیم غلط تھی۔ میرا کہنا یہ ہے کہ اگر ایک دن پاکستان بنتا اور دوسرے دن ٹوٹ جاتا، تو بھی پاکستان کی تخلیق صحیح تھی۔ میرا یقین ہے کہ پاکستان کو غریب آدمی نے بگاڑا ہے نہ اجاڑا ہے۔ پاکستان کو نیم پڑھ لوگوں نے جو اپنی اپنی کمتریوں میں الجھے ہوئے تھے۔ جنھوں نے ہر چیز کو اپنے ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ ان میں سے کوئی دانشور نہیں تھا۔ کوئی عالم نہیں تھا۔ بیشک انہوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہوئی ہیں۔ مگر ان کے دل میں کوئی ایسی آرزو نہیں تھی کہ خلقِ خدا کی خدمت کرتے۔ ملک کو بناتے۔ یہ ایک وجاہت کے پیٹرن میں آئے اور چلے گئے۔ اب بھی بہت کچھ ہو رہا ہے۔ مگر ملک سخت جان ہے اور لوگ امید منقطع نہیں کر رہے ہیں۔ یقین ہے انشاء اللہ کہ ان کو صلہ کبھی نہ کبھی ضرور ملے گا۔

پاکستان کو غریب آدمی نے بگاڑا ہے نہ اجاڑا ہے۔ پاکستان کو نیم پڑھ لوگوں نے جو اپنی اپنی کمتریوں میں الجھے ہوئے تھے۔ جنھوں نے ہر چیز کو اپنے ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ ان میں سے کوئی دانشور نہیں تھا۔ کوئی عالم نہیں تھا۔ بیشک انہوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہوئی ہیں۔ مگر ان کے دل میں کوئی ایسی آرزو نہیں تھی کہ خلقِ خدا کی خدمت کرتے

سوال: پھر ایک ذاتی سا سوال اور یہ لوگ اکثر اوقات ڈسکس بھی کرتے ہیں کہ آپ اکثر اوقات اپنے لیکچرز اور گفتگو کے دوران زیادہ تر دانشوروں، شاعروں، ادیبوں، صوفیوں اور علماء پر کڑی تنقید کرتے ہیں اور ہم نے آپ کو کسی شخصیت کی تعریف کرتے یا سراہتے ہوئے کم کم ہی دیکھا ہے۔ کیا آپ سب کی نفی کر کے اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کی کوشش تو نہیں کرتے؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: ماشاء اللہ اچھا سوال ہے۔ مگر میری بھی زندگی کا ایک اصول ہے کہ میں کوئی شخصیاتی تنقید کبھی بھی نہیں کرتا۔ مگر میں نے بڑی مشقت سے کچھ سبق سیکھے ہیں۔ علم میں کسی کو رعائت دینے کا مجھے کبھی خیال ہی نہیں آیا۔ کیونکہ علمی رعایتوں کی وجہ سے ہی ہم انتہائی مذہب کے کنفیوز کانسپٹ تک پہنچ چکے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر مجھے یہ کہیں کہ فلاں شخص صاحب العجم ہے، فلاں علامہ دہر ہے، تو مجھے ان پر بڑی شدت سے اعتراض ہوتا ہے۔ میں ادھر دیکھتا ہوں کہ واٹسن جیسا بندہ جس نے ڈبل ہیلکس دریافت کیا ہے اور دوسرے جو آفاقی انکشافات کے حامل لوگ ہیں۔ اگر ان کے نام کے ساتھ آپ کبھی القابات نہیں دیکھتے ہیں۔ انہیں بس ایک اور دانشمند شخص سمجھا جاتا ہے۔ ان کو میں سوچتا ہوں، آخر کیا مرض پڑا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ میں نے اپنی ذات کے لیے بھی ایک پوری کتاب دیکھی ہے۔ بڑے بزرگ لوگ مستند سمجھے جاتے ہیں۔ بہت سارے لوگوں کے نزدیک، جن میں ان کا ایک رسالہ دیکھتا ہوں، تو نیچے عجیب قسم کے لفظ لکھے ملتے ہیں اور ساتھ ہی ان کا سلسلہ ولائت لکھا جاتا ہے۔ چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ، اویسیہ۔ آخر اس کی کیا ضرورت ہے؟ سوائے اس کے کہ وہ آپ کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ میں بہت بڑا ولی ہوں اور وہ ان سارے سلسلوں کی میراث لیے بیٹھا ہے۔ اب ہمارے پاس رستہ ہی کوئی نہیں۔ کسی طریقے سے بھی تم بچ کے نہیں جا سکتے۔ اگر تم اویسیہ ہو، تو میں اویسیہ ہوں۔ چشتیہ مانو، تو چشتیہ ہوں۔ قادریہ مانو، تو قادریہ ہوں۔ اس قسم کی غیر معقول حجتیں مجھے پسند نہیں آتیں۔ ان میں میں کوئی رعایت نہیں کرتا۔ اپنے ساتھ نہ کسی کے ساتھ۔

باقی میرا خیال یہ ہے کہ ذاتی ملاقاتوں میں کوئی شخص مجھے یہ الزام نہیں دے سکتا کہ میں نے آج تک انفرادی ملاقاتوں میں کبھی بھی کسی کی ذاتی طور پر توہین کی ہو۔ مگر جہاں آپ لوگوں کو ہدایات پاس کرنی ہیں، تو انہی عقیدتوں کے سہارے ہم نے توڑی ہیں۔ تاکہ لوگ علم کو تلاش کریں۔ اسی اندھے پن میں بصارت کی آگ کو کوشش کرنا پڑتی ہے۔ کچھ لوگ اس وجہ سے ناراض ہوتے ہیں۔ میں نے بہت سارے لوگوں کی تعریف بھی کی ہے اور سب سے زیادہ تعریف میں نے اللہ کے رسول ﷺ اور اصحابِ رسول کی کی ہے۔ مجھے یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ آج تک بڑے سے بڑا شیخ کسی صحابی سے کیسے بڑھ سکتا ہے، جو اپنی ترجیح کے مکمل احساس میں ہے اور یہ صاحب اپنی ذاتی ترجیح استعمال کر رہے ہیں۔ بڑے بڑے دانشور اور علماء دنیا میں گزرے ہیں۔ بڑے بڑے عالمانِ حقائق گزرے ہیں۔ لوگ ان کو تسلیم کرتے ہیں۔ صدیاں ان کے نام سے منسوب ہیں۔ مگر جب میں یہ جان لوں کہ اس کی بنیادی

ترجیح ہی اس کی سمجھ میں نہیں آئی، تو میں اسے عالم کیسے سمجھ لوں؟ کیسے ہم جانیں گے؟ ہوسکتا ہے، اس بات کو غلط کرنے کے لیے آپ کو میری ساری اپروچ ہی غلط کرنی پڑے گی۔ اگر میری ساری اپروچ غلط ہے، پھر وہ صحیح ہیں۔ اور اگر میری اپروچ صحیح ہے، تو اس کا تو وقت، زمانہ اور مقام ہی فیصلہ کرے گا۔ اگر میری اپروچ صحیح ہے، تو پھر جو میرے اعتراضات ہیں ان کی طرف سے ان پر علمی جواب آنا چاہیے۔ اس میں ذاتی توہین تو مراد ہی نہیں ہے۔ اس میں بعض اوقات لفظ میرے ذہن میں چبھ جاتے ہیں۔ جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ کسی نے کسی کے لئے مبالغہ آمیز لفظ لکھا ہے، تو مجھے یہ لفظ بہت چبھتا ہے؟ میں سوچتا ہوں، یہ کیوں ایسے لفظ استعمال کرتے ہیں؟ بہت ساری شخصیات کے ساتھ جو لفظ استعمال ہو رہے ہیں، غلط ہیں۔ ویسے تو میری گلی کا مولوی بھی زبدۃ العلماء لکھتا ہے۔ اپنے ساتھ رئیس الخطیبین لکھتا ہے۔ کیا اس کو درست کہا جاسکتا ہے؟ وہ ایک عام آدمی کی طرح کیوں نہیں رہتے؟

جب تک کوئی تصور آپ کا آفاقی نہ بن جائے۔ جب تک کوئی خیال آپ کا یعنی ایک یقینی اپروچ نہ بن جائے، اس وقت تک آپ کی شاعری بڑے نچلے گریڈ میں رہے گی۔ مگر اس نچلے گریڈ کی شاعری میں بھی وہ شعر ابدی ہوجائے گا، جو عمومی کیفیات پر لکھا ہوا ہے

تو کوشش تو یہی کرنی چاہیے کہ ہم دوسرے لوگوں کی طرح ہوں۔ اللہ کا شکر ہے، میرے احباب میرا مزاج بھی سمجھتے ہیں اور کسی قسم کی جائز تعریف سے بھی گریز کرتے ہیں۔ میرے تو شاگرد ایسے ہیں کہ منہ پھاڑ کر مجھ پر اعتراض کر رہے ہوتے ہیں۔ آپ یقین جانیے کہ سادہ سے سادہ میرا دوست جو ہے، اگر اسے مجھ میں کوئی بات اچھی نہیں لگتی، تو وہ اس پر ایک نہیں سراسر اعتراض جاری کر دے گا کہ مجھے آپ کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔ آپ یہ کیوں کرتے ہیں؟ یہ ہم میں بے تکلفی موجود ہے۔ اس قسم کا کوئی پرابلم ہمارے لوگوں کو نہیں ہے۔

سوال: سر آپ بنیادی طور پہ لٹریچر کے آدمی ہیں۔ ایک طویل مدت تک آپ نے لٹریچر پڑھایا ہے اور یقیناً لٹریچر کے بارے میں آپ کی اپروچ بھی بڑی منفرد ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ شاعری کس اعتبار سے کسی ملک، قوم اور افراد پر مثبت اثرات مرتب کرسکتی ہے؟ اور اگر واقعی ایسا نہیں، تو پھر شاعری کیوں کر معاشروں اور انسانوں کی تباہی کا سبب بنتی ہے؟ کیا افلاطون کا اپنی republic (ریپبلک) سے شاعروں کو نکال دینے کا فیصلہ درست تھا؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: شاہ صاحب حیران کن بات آپ کو بتاؤں کہ انگریزی میں جان ملٹن ایک بڑا شاعر ہے۔ اور بڑی عجیب بات جو پہلے کسی کے ذہن میں نہ آئی ہو کہ جان ملٹن نے جو اپنا شاہکار لکھا، Paradise Lost (جنت گمشدہ) اس کا موضوع مذہب تھا۔ گو کہ وہ بہت بڑا فلاسفر، دانشور اور شاعر تھا، مگر جو اس کی اعلیٰ درجے کی کتاب ہے، وہ مذہب کے موضوع پر ہے۔ دانتے اپنے وقت کا بہت بڑا شاعر ہے، مگر اس کی شہرت اس کی مذہبی موضوعات کی کتاب کی وجہ سے ہے۔ ہمارے ہاں اقبال بہت بڑا شاعر ہے۔ اتنا بڑا شاعر کہ بہت سارے شاعر اس کے سائے تلے پس گئے ہیں۔ مگر اس کا موضوع بھی مذہب ہے۔ تو ہوتا یہ ہے کہ شاعری اپنے موضوعات کے لحاظ سے ترفع پاتی ہے، گریڈ بناتی ہے۔ جہاں حضرت داغ نے اپنے دیوان کی اوصاف کی بات کی، مجھے بھی وہ شعر بڑا پسند ہے کہ

تیرے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

مگر یہ موضوعات وقتی آپ کو تسکین دیتے ہیں۔ یہ آپ کے اندر کوئی مستقل اثر نہیں چھوڑتے۔ تو شاعری بھی جب کسی بڑے مقصد سے ناآگاہ ہوگی، تو وہ مقامی ہوگی، کم عرصہ زندہ رہے گی۔ دور کیوں جاتے ہیں۔ آپ فیض کو دیکھئے۔ کچھ دن ہی ہوئے ہیں اس کو تو بھئی کوئی انعام مل رہا ہے۔ جس کو روسی انعام دے رہے ہیں۔ دنیا اس کو بڑا شاعر سمجھ رہی ہے۔ اس کی اس شاعری کی وجہ سے، جو اس نے جدید موضوع پر کی۔ جو اس نے سرمایہ داری کے خلاف لکھی یا وہ نظمیں، جو اس نے اپنے خیال میں اس نے سوشلسٹ کانسپٹ پر لکھیں۔ اب وہ نظمیں پڑھنے والے کوئی نہیں رہ گئے۔ وہ ایک لوکل موضوع ہے، جو گزر جاتا ہے۔ شاعری اسی وقت بلند تر ہوتی ہے، جب وہ اپنے موضوع کو بلند کرتی ہے۔ غالب کو دیکھئے کہ آج بھی وہ مابعد الطبیعات کا شاعر ہے۔ وہ ذات سے نکل کر بات کرتا ہے۔ اپنے خیالات کو ابدیت میں لے جاتا ہے۔ یعنی اصول تمام بڑے کلام، بڑی شاعری، بڑے ادب کا یہ ہے، جو پرسنل نہ ہو۔ بلکہ پرسنل کیفیت سے گزرتا ہوا عالم گیر ہوجائے۔ اب اگر اس قسم کی شاعری موجود نہیں ہے، جسے ہم دیکھتے ہیں۔ میں نے پاکستان کی شاعری کا بہت برا حال دیکھا ہے۔ لاہور کو میں نے اسی میں چھوڑا۔ اسی، ستر اور اسی کے درمیان ہمارے پاس وجودیت کا تصور آیا۔ تو میں دیکھ رہا تھا کہ تمام شاعری وجودیت ہوگئی۔

یہ جو جلدی جلدی نگلنے اور اگلنے کا عمل ہے، یہ کہیں بھی پائیداری کا سمبل نہیں بنتا۔ جب تک کوئی تصور آپ کا آفاقی نہ بن جائے۔ جب تک کوئی خیال آپ کا یعنی ایک یقینی اپروچ نہ بن جائے، اس وقت تک آپ کی شاعری بڑے نچلے گریڈ میں رہے گی۔ مگر اس نچلے گریڈ کی شاعری میں بھی وہ شعر ابدی ہوجائے گا، جو عمومی کیفیات پر لکھا ہوا ہے۔ جو عمومی ہے۔ جو لوگوں کے کسی بڑے حساس اور سادہ جذبے کو راہ دے رہا ہے۔ وہ پھر بھی باقی رہ جاتا ہے اور ایسے شاعر تو کہیں نا کہیں موجود ہیں۔ مگر بڑا شاعر ابھی پیدا نہیں ہوا۔ اقبال کی بڑی زیادتی ہے۔ اقبال نے بڑا جبر کیا۔ اس کی ایک بڑی شاعری نے لمبی طویل لائن چھوڑ دی چھوٹے شاعروں کی۔ باقی رہی افلاطون کی وہ بات، تو افلاطون تھوڑا سا اس میں اس کے گریڈ میں تکبر استعمال کر گیا۔ چونکہ فلاسفرز کو جاننا ۔۔۔۔۔۔۔اور بہت بڑا ۔۔۔۔۔۔۔۔ہے اور شاعر چونکہ معاشرے سے بھی گریز کر رہا ہے۔ فلسفہ حیات سے بھی گریز کر رہا ہے۔ اس وقت بھی شاعر آج ہی کے دور کی طرح ہوتے ہوں گے ۔ موضوع کو اٹھا آسمان تک لا رہے ہیں اور قافیہ، ردیف ڈھونڈ رہے ہیں، تو غالباً ان کی عملی نااہلی کی وجہ سے افلاطون نے یہ کہا ہوگا۔

سوال: سر آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں۔ یہ مادی پرستیت کا دور ہے اور ہم چیزوں کا معیار اپنے نفع ونقصان سے دیکھتے ہیں کہ جس چیز کا ہمیں مالی فائدہ ہے، وہ ہمارے لئے اہم ہے اور جس سے کوئی مالی منفعت ہم حاصل نہیں کر سکتے، اس کی اہمیت بہت کم ہے۔ تو آپ اس مادیت پرستی کے دور میں شعر وادب کی کیا اہمیت اور افادیت قرار دیتے ہیں؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: شاہ صاحب معاشرہ ہمیشہ کسی نہ کسی عبوری دور سے گزرتا ہے۔ بعض اوقات کسی بڑے عبوری دور سے گزرتا ہے اور اس دور سے گزرتے ہوئے مذہبی اور ذہنی انارکی، قدروں کی انارکی پیدا ہوتی ہے۔ انارکی اور اس عبوری دور کا کنٹرول اگر کسی بڑے دانشور، سوچنے سمجھنے والے طبقے کے ہاتھ میں ہے، تو عبوری دور، یہ دور زماں بغیر کسی تصادم اور خطرے کے گزرتا ہے۔

مگر جب یہ دور کم عقلوں کے ہاتھ میں ہوگا، تو اس کے نتائج بڑے خوفناک ہوں گے۔ آپ جیسے ابھی ماڈرن زمانے میں معاشرے کے اثر ونفوذ کو دیکھیں کہ جیسے صدر صاحب نے فرمایا کہ جس کو آنکھیں بند کرنا ہیں، وہ بند کرلے اور نیکریں پہن لو اور دوڑ میں لگ جاؤ۔ تو یہ عبوری دور کی مٹی پلید کی جارہی ہے۔ یہ اس میں سے سرخرو ہونے کا طریقہ نہیں ہے۔ کم عقل لوگ چاہتے ہیں کہ اس سے عبوری دور گزرے۔ یہ بنیادی طور پر بڑے رنجیدہ انداز میں تبدیلی چاہتے ہیں۔ یہ بڑا ہی غلط بندوبست ہے۔ اس سے کوئی معاشرہ تبدیل نہیں ہوتا۔ بلکہ الٹا اس سے ذہنی انارکی کے کچھ پہلو پیدا ہوتے ہیں۔ شاعر اور ادیب ایک حساس مخلوق ہے، جو اس تبدیلی کو محسوس کرتی ہے۔ اب اگر شاعر اور ادیب اس تبدیلی کو پروان نہیں چڑھا رہا۔ یہ بڑی اہم بات آپ کو بتا رہا ہوں کہ اگر ہمارا شاعر اور ادیب اپنے ذہن کی انارکی اور بحران کو درست نہیں کرتا اور وہ تبدیلی کو تحمل اور شعور سے پیش نہیں کرتا، تو وہ بیکار ہے۔ مگر بہت سارے شاعر اور ادیب جب اس انارکی کا حصہ ہو جاتے ہیں اور اس تبدیلی کے لپیٹے میں پس جاتے ہیں یا اس سے آگے گزر کر اس کا حل پیش کرتے ہیں، وہ اسی تنازعے میں آکر خود بھی ایک مجبور محض ہو کر رہ جاتے ہیں، تو وہ شعر وادب کسی کام کا نہیں ہوتا۔ پاکستان میں بدقسمتی سے ایسا کوئی ادیب میری نظر میں نہیں ہے، جو اس وقت کی مذہبی اور ذہنی انارکی سے نبٹے اور اس کے بعد کوئی بہتر قسم کا شعور بخشے۔ اس لئے شاعر وادیب اس وقت مجھے تو بیکار ہی لگتے ہیں۔

سوال: آج کل ہماری سیاست میں فوج کا عمل دخل ہے اور اس کا کردار بڑھتا جارہا ہے۔ کیا اس سے ہمیں بحیثیت قوم نقصان ہو رہا ہے یا فائدہ؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: شروع سے آپ اگر تاریخ عالم دیکھتے ہیں، تو ملکوں کی حیثیتوں میں یہی جو جنرل ہے، اس کا بادشاہ بنتا ہے۔ تو فوج کی کوئی بغاوت اسی طرح ہوتی ہے اور جب وہ بادشاہ بنتا ہے، تو اس سے فوج سولائزیشن میں داخل ہو جاتی ہے۔ بدقسمتی سے ہماری فوج کبھی سولائزیشن میں داخل نہیں ہوئی ہے۔ فوج فوج ہی رہتی ہے۔ اس کا مہذب دنیا کے ساتھ تعامل کبھی مضبوط نہیں ہوتا ہے۔ اصولاً وعلماً وعقلاً کوئی بھی بادشاہ ڈیکلئر ہو یا سب سے بڑا ڈیکلئر ہو، اس کو سول کے انداز اور طریقے سیکھنے ہوتے ہیں۔ کیونکہ لوگ بہرحال وردی سے خوفزدہ ہوتے ہیں۔ تمام عمومی لوگ جو ہیں، وہ آج کی وردی ہو یا کل کی، ایک لمبے عرصے تلوار کو لٹکتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ تو لازم بات ہے کہ فوجی جو بھی قابو پاتے ہیں، اس کو جلد سے جلد اپنی خلافت یا اپنی بادشاہت کے دور میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ اس کلچر کو سولائزڈ ہونا پڑتا ہے۔ اب پاکستان میں جتنے فوجی غلبے آئے ہیں، وہ سولائزیشن کی حدود میں داخل نہیں ہوئے ہیں، جس کی وجہ سے لوگ ان سے مزید خوفزدہ ہو رہے ہیں اور وہ کوئی اچھا تاثر نہیں دے رہے۔ اس کا ایک نتیجہ ایک اور انقلاب ہے یا اس کا نتیجہ اقتدار کی جزوی منتقلی ہے۔ اور چونکہ لگتا ہے کہ اب تو آدمی واقعی صدر بننا چاہتا ہے اور انھوں نے اگر ایسا کرنا ہی ہے، تو پھر انھیں تہذیب کا حصہ بننا ہوگا۔

سوال: کیا ہمارے سیاستدان کرپٹ ہیں یا نا کام یا ہمارے ملک کے سیاستدانوں کو قوم وملک کی خدمت کرنے کا موقع ہی فراہم نہیں کیا گیا ہے؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: ہمارے سیاستدانوں کا وژن بڑا محدود ہے۔ وہ جس مقامی پوزیشن سے نکلتے ہیں، اس سے کبھی باہر نہیں جاتے۔ مثلاً اگر آپ آج بھی کوشش کریں کہ ایک لوکل سیاستدان کو آپ ایک بین الاقوامی سطح پر لے جائیں، تو وہاں اس کے پاس تعلیم ہے نہ اس کے پاس انداز ہے نہ اس کے پاس اقتدار کے کچھ بنیادی اصول ہیں۔ میں اس وقت جو جتنے سیاستدان ہیں، ایک طرف دیکھتا ہوں، تو دنیا کے ذہین ترین، اعلیٰ ترین لوگ ہیں، ان کی سلطنت کے تناظر میں چودھری شجاعت کا وہاں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ان کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ اس طرح جب میں دیکھتا ہوں، تو مجھے جنرل پرویز مشرف بڑے عجیب سے لگتے ہیں۔

دنیاوی سیاست کے پہلو پر ہمارے جو سیاستدان ہیں، ایک تو پڑھے لکھے نہیں ہوتے۔ بنیادی طور پر یہ سکولوں سے بھاگے ہوئے لوگ ہیں، جنھوں نے کبھی کوئی چیز مکمل نہیں کی۔ دوسرے یہ زمینداری نظام کی پیداوار ہیں۔ منصب داری سسٹم کی پیداوار ہیں، جو ملک کو بھی منصب داری سسٹم کے تحت چلا رہے ہیں۔ کیونکہ ان کو کسی اور سسٹم کا شعور نہیں ہے۔ یہ ملک کو بھی منصب داری نظام کے تحت چلانا چاہتے ہیں۔ منصب داری نظام میں بڑے صاحب کو اجازت دینی ہوتی ہے اور سفارش اور رشوت کا تعلق عام ہوتا ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے، اگر بیوروکریٹس کی اکیڈمی ہو سکتی ہے، تو سیاستدانوں کو بھی کم از کم سیاست کے کچھ اصول سکھانے کے لئے ایک اکیڈمی ہونی چاہیے۔

سوال: سر ہم اپنی سیاست کو کس طرح مقدس، مقدم اور عوام دوست بنا سکتے ہیں؟ اور کیا اس میدان میں پڑھے لکھے لوگوں کی آمد کی ضرورت ہے یا نہیں؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: پڑھے لکھے لوگ بنیادی طور پر نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کلاس کے لوگ زندگی کی تلاش اور رزق کی مصروفیات میں مستقبل سے اتنے خوفزدہ ہیں کہ کوئی رسک ہی نہیں لے سکتے۔ اپنی زندگی گزارنے کے علاوہ کسی قسم کی ہمارے ملک میں قیادت کے رستے اس لئے مکمل بند ہیں کہ کوئی نچلے متوسط طبقے کا لڑکا سیاست کو بحیثیت پیشہ اختیار نہیں کر سکتا۔ صرف کوئی حادثہ اسے سیاست میں لے آئے، تو دوسری بات ہے۔ ہمارے یہاں جتنے بہترین عوام دوست بھی پیدا ہوئے ہیں، وہ زمینداروں کے طبقے سے ہیں اور وہ بھی ایسے طبقے سے، جہاں بھوک اور افلاس کا کبھی دورہ نہیں ہوا۔ جہاں آسائشات کثرت سے تھیں۔ ایک بات جو مجھے کبھی سمجھ میں نہیں آئی کہ جس شخص نے کبھی فاقہ نہیں کیا یا

پاکستان میں بدقسمتی سے ایسا کوئی ادیب میری نظر میں نہیں ہے، جو اس وقت کی مذہبی اور ذہنی انارکی سے نبٹے اور اس کے بعد کوئی بہتر قسم کا شعور بخشے۔ اس لئے شاعر وادیب اس وقت مجھے تو بیکار ہی لگتے ہیں

ہمارے سیاستدانوں کا وژن بڑا محدود ہے۔ وہ جس مقامی پوزیشن سے نکلتے ہیں، اس سے کبھی باہر نہیں جاتے۔ مثلاً اگر آپ آج بھی کوشش کریں کہ ایک لوکل سیاستدان کو آپ ایک بین الاقوامی سطح پر لے جائیں، تو وہاں اس کے پاس تعلیم ہے نہ اس کے پاس انداز ہے نہ اس کے پاس اقتدار کے کچھ بنیادی اصول ہیں

بھوکا نہیں رہا، وہ بھوکوں کے مسائل کیسے سمجھ سکے گا؟ ان لوگوں کو پتا ہی نہیں ہے کہ غربت کیا ہوتی ہے۔ غربت کے مسائل کیا ہوتے ہیں اور جو غریبوں میں سے اٹھتا ہے۔ جو ورکر خوش قسمتی سے کبھی الیکشن میں آجائے، وہ اپنے طبقے سے فرار حاصل کر رہا ہوتا ہے اور اس غربت کے ماحول میں پلٹنا نہیں چاہتا۔ دونوں طرف یہ بدقسمتی سیاست کو عوام تک نہیں آنے دیتی ہے۔

سوال: سر یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان کی زندگی نہایت مختصر ہے۔ لیکن اس میں ہمیشہ زندہ رہنے کی تمنا اور ہوس کیوں پیدا ہوتی ہے؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: بڑا خوبصورت سوال ہے، جس کے لئے مجھے تھوڑا سا سوچنا پڑے گا۔ مگر میرا خیال یہ ہے کہ مذہب اس کا جواب دیتا ہے۔ مذہب اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ آدمؑ کا جب ظہور ہوا اور جب انھوں نے عقل پائی، تو انھوں نے دیکھا کہ میں ابدی لوگوں کے بیچ میں ہوں۔ انھوں نے دیکھا کہ بڑی بڑی لمبی لمبی عمروں کے بیچ میں ہوں۔ خدا لازوال ہے۔ ملائکہ لازوال بڑی طویل عمروں کے لوگ ہیں۔ تو ایک بڑی قدرتی سی خواہش ان میں پیدا ہوئی کہ میری زندگی اتنی ہی ہو، جتنی ان لوگوں کی زندگی ہے، تو ابدیت شعور کی وجہ سے ہے۔ شعور باقی رہنا چاہتا ہے، زندہ رہنا چاہتا ہے۔ وہی بات جو میں نے پہلے کی کہ آپ کیسے جانتے ہیں؟ مجھے پتا نہیں ہے کہ جانوروں میں یہ شعور موجود ہے کہ نہیں۔ کیونکہ میں اس حد کے دماغ سے گزرا نہیں ہوں۔ مگر ایک بات کا مجھے پتا ہے کہ زندگی اگر شعور سے عاری ہو، تو وہ زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ اسے کسی قسم کی زندگی کی خواہش نہیں ہوتی۔ زندگی بذاتِ خود طوالت قدر ہے۔ اسی کے اندر انتہائی شعور ہے باقی رہ جانے کا۔ ہمارا یہ جو پورا سلسلۂ تناسل ہے اور یہ جو ہمارے نسلوں کے سلسلے ہیں، یہ بھی ہم سے تقاضہ کرتے ہیں کہ ہم نام چھوڑنا چاہتے ہیں۔ نام چھوڑنے کی خواہش بھی اگلی نسلوں میں اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی خواہش ہے۔ تو یہ زندہ رہنے کی خواہش ہمیں اپنے ہم نشینوں سے حاصل ہوئی ہے، جو بڑی طویل عمروں والے ہیں۔

ہمارا یہ جو پورا سلسلۂ تناسل ہے اور یہ جو ہمارے نسلوں کے سلسلے ہیں، یہ بھی ہم سے تقاضہ کرتے ہیں کہ ہم نام چھوڑنا چاہتے ہیں۔ نام چھوڑنے کی خواہش بھی اگلی نسلوں میں اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی خواہش ہے۔ تو یہ زندہ رہنے کی خواہش ہمیں اپنے ہم نشینوں سے حاصل ہوئی ہے، جو بڑی طویل عمروں والے ہیں

سوال: سر بہت وقت گزر چکا ہے اور بڑی اچھی گفتگو ہوئی ہے۔ میں پہلے بھی آپ کا شکریہ ادا کر چکا ہوں۔ تو آخری سوال میں اجازت چاہوں گا آپ سے پوچھنے کے لئے کہ محبت اندھی کیوں ہوتی ہے اور کیا محبت کرنا، محبت کرنے والے کے بس میں ہوتا ہے یا ایک مکمل بے بسی اور بے اختیاری اس کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور وہ اس رو میں بہتا چلا جاتا ہے؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: یہ تصور غلط ہے۔ محبت اندھی بالکل نہیں ہوتی ہے۔ محبت بہت سیانی ہوتی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم جب کسی کو محبت کرنے والا دیکھتے ہیں، تو ہمارے خیال کے مطابق باقی لوگ جو اس پر رائے دے رہے ہوتے ہیں، وہ ضرور اندھے ہوتے ہیں۔ ان کو یہ نہیں پتا ہوتا کہ ان کی قدر مشترک کیا ہے، جس کی وجہ سے یہ محبت پروان چڑھی ہے۔ چلیں میں آپ کو ذرا سسی پنوں کی مثال دے دوں۔ پنوں اختیار سے محبت کر رہا ہے اور زمانہ دیکھ چکا ہے۔ وہ آیا ہے۔ اس کو اچانک ایک خوبصورت خاتون نظر آگئی ہے۔ وہ ایک امیر زادہ ہے، جس کے دل میں ایک چیز کو حاصل کرنے کا جنون ہے اور وہ اس جنون کو مکمل کرتا ہے۔ سسی کے حصول میں سادہی اس کی خواہش بن جاتی ہے، جنون بن جاتا ہے۔

یہ تصور غلط ہے۔ محبت اندھی بالکل نہیں ہوتی ہے۔ محبت بہت سیانی ہوتی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم جب کسی کو محبت کرنے والا دیکھتے ہیں، تو ہمارے خیال کے مطابق باقی لوگ جو اس پر رائے دے رہے ہوتے ہیں، وہ ضرور اندھے ہوتے ہیں۔ ان کو یہ نہیں پتا ہوتا کہ ان کی قدر مشترک کیا ہے، جس کی وجہ سے یہ محبت پروان چڑھی ہے

اب آپ سسی کی نظر سے دیکھیں۔ سسی بہت خوبصورت ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس پست سے ماحول میں ایڈجسٹ نہیں کر پا رہی ہے اور پھر اچانک ایک شہزادہ آ نکلتا ہے۔ جب وہ اس کو تلاش کرتا ہے، تو اگر آپ غور کریں، تو طباع کے اختلاف سے تمام محبتیں جنون تک پہنچ گئی ہیں۔ یہی سوہنی مہینوال کا حال ہے۔ یہ ہی قیس و لیلیٰ کا حال ہے۔ یعنی جب ایک شخص کی انتہائی شدید خواہش ایک پیٹرن آف لائف سے نکل کر دوسرے پیٹرن آف لائف تک جاتی ہے، تو یہ محبت کو جنون بنا دیتی ہے۔ جو محبتیں ہمارے پاس مثال کے طور پر موجود ہیں، ان کے ڈائیلاگ اتنے منتقل نہیں ہوئے۔ مگر اپروچ سے نظر آتا ہے کہ ایک پست درجے کی حسینہ یا نوجوان ایک بڑے طبقے کی محبت کو زیادہ پائیدار کر دیتا ہے۔ جیسے فرہاد شیریں کی محبت کو پائیدار کر دیتا ہے۔ پھر سوال یہ ہے کہ ان کو کوئی اور جوائس نصیب نہیں ہوئے۔ میں کل ہی بات کر رہا تھا کہ ہمارے یہاں محبت اس لئے زیادہ کامنے کہ اس میں ہمیں اختیارات یا جوائس نصیب نہیں ہوتے۔ ہم اتنے اندر سے گئے گزرے ہوتے ہیں۔ اتنے بحرانوں کے، کمتری کے شکار ہوتے ہیں کہ جو پہلا چانس ہمیں ملتا ہے، اسے ہم انگیخت کر لیتے ہیں۔ ہم اس کو بڑی شدت سے پکڑ لیتے ہیں۔

پھر انس کی کیفیت شاید محبت کی بنیاد ہے کہ جب آپ کسی سے انس محسوس کریں۔ اور انس انسانیت کی بھی بنیاد ہے۔ جب انسان دوسرے انسان کے لئے زیادہ خلوص محسوس کرتا ہے یا کسی کی کمپنی میں شاید ہوتا ہے یا کسی کے قریب تر رہنے کی کوشش کرتا ہے، تو یہ تمام تر صفاتی ہے۔ اس میں فزیکل عنصر بہت کم آتا ہے اور جسمانی والی جوانس ہوتی ہے، اس کو مودت کہتے ہیں اور جو صفاتی چیز ہے، اس کو محبت کہتے ہیں۔ تو محبت کا اگر تجزیہ کیا جائے، تو سوائے خدا کے جس میں اس قسم کے عناصر نہیں ہوتے ہیں۔ مگر بہت سے لوگ جو میرے پاس خدا کی محبت کا دعویٰ لے کر آتے ہیں، اس کے پسِ منظر میں یا تو مالی ضرورت نکل آتی ہے یا کسی عورت کی خواہش نکل آتی ہے۔ جب اس کو واچ کرتے ہیں، تو پتا چلتا ہے کہ یہ آدمی خدا کو نہیں، بلکہ ان چیزوں کو چاہ رہا ہوتا ہے۔ تو محبت کے جائزے کے بعد تبھی آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اندھی ہے۔ اگر آپ دونوں شخصیات کا درست طور پر تجزیہ کریں۔ ان کے احساسات، ان کی نفسیات کو دیکھیں کہ کس چیز کو محبت تسکین دیتی ہے، تو محبت اس چیز کا بہت بڑی ازالہ کرنے والی چیز ہے۔

■■